رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۳۰

عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے

قیمت فی پرچہ ۶۳ پیسے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۷	نومبر ۱۹۶۱ء	عدد ۲

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

گزشتہ ہفتے مجھے اپنے چند دوستوں کے ہمراہ ایک ایسی جگہ سے گزرنے کا اتفاق ہوا جو چند سال پیشتر بالکل ویرانہ تھا مگر اب وہاں جدید ڈیزائن کی بیشمار سر بفلک عمارتیں کھڑی ہیں۔ شہر کے اس خوبصورت حصہ کو دیکھ کر کوئی انسان ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ یہ قطعہ ارضی پاکستان جیسے پس ماندہ ملک کا کوئی ٹکڑا ہو سکتا ہے جس کے بسنے والوں کی اوسط آمدنی دس آنے یومیہ ہے۔ پاکستان کے اس غلیشن ایبل حصہ کی دولت و ثروت پر تبصرہ کرتے ہوئے میرے ایک رفیق نے کہا "ملک نے چند سالوں کے اندر حیرت انگیز ترقی کی ہے" اس پر دوسرے صاحب نے جو تاریخ اور اسلامی علوم کے ایک بہت بڑے عالم ہیں فوراً فرمایا "حضور یہ ترقی نہیں بلکہ تنزل کی علامت ہے۔ یہ عمارات ملک میں غیر عادلانہ تقسیم دولت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ انہیں دیکھنے سے ایک انسان فوراً اس امر کو جان سکتا ہے کہ یہ قوم عیش و تنعم کی پرستار ہے اور اس کا مرکز و محور دنیاوی فوائد و لذائذ کا حصول ہے، اس کے دل میں نفس پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ یہ فلک بوس محلات قومی ترقی کی شہادت نہیں دیتے بلکہ قربِ قیامت کی دہائی دے رہے ہیں"

ہماری زندگی کے اس شعبہ کے متعلق یہ دو متضاد اور متناقض آرا درحقیقت اس وسیع ذہنی کشمکش کا نتیجہ ہے جس میں اس وقت پوری قوم گرفتار ہے اور یہی چیز وہ اصل بیماری ہے جو ہماری قوم کی فکری اور عملی قوتوں کو گھن کی طرح اندر ہی اندر سے کھا رہی ہے۔ ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ ہم نے آج تک پورے اخلاص اور یکسوئی سے اس امر کا

فیصلہ نہیں کیا کہ ہمیں کدھر جانا ہے اور ہم کس سمت بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ قوم کے دردمند کبھی تو اس صورتِ حال کو دیکھ کر قوم کو کوستے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس قوم کی ساری تعمیری صلاحیتیں ختم ہو گئی ہیں اور کبھی غیر ملکی سامراجی طاقتوں کو ہدفِ طعن بناتے ہیں لیکن عقل یہ ماننے پر تیار نہیں ہوتی کہ وہ قوم جو گزشتہ بارہ سو برس سے مختلف قسم کی گمراہیوں کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کرتی چلی آ رہی ہو اور جسے اس معاملہ میں نہ تو غیروں کی قہرمانیاں اور دغابازیاں اصل مقصد سے باز رکھنے میں کامیاب ہوئی ہوں اور نہ اپنوں کی چالاکیاں اور عیاریاں جادۂ مستقیم سے ہٹا سکی ہوں، وہ قوم گزشتہ چودہ سال کے قلیل عرصے میں بے شعور اور بے حس جانوروں کا ایک گلہ بن کر رہ جاتے جسے ذاتی اغراض بالکل میکانکی طور پر جس طرف چاہیں ہانک کر لے جائیں۔

ہمارے نزدیک قوم کے اندر اس ذہنی خلفشار کی اصل وجہ وہ شدید احساسِ ناکامی ہے جو پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا ہے۔ ہماری حالت قرآن مجید کی اس تمثیلی بڑھیا کی سی ہے جو بڑی محنت اور مشقت کے بعد سوت کاتتی ہے مگر پھر اُسے خود اپنے ہی ہاتھوں سے تار تار کر دیتی ہے۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد جب غیر ملکی سامراج نے ہم پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تو ہمارے اندر یہ شعور بیدار ہوا کہ ہماری یہ سیاہ بختی ہماری اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔ ہم نے جس وقت سے اسلام سے منہ موڑا ہے اسی لمحہ سے ہم مختلف قسم کے مصائب کا شکار ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ہماری بربادی ذلت اور خواری کی اصل وجہ خدا سے بے تعلقی اور اس کے احکام سے روگردانی ہے۔ یہ ہماری دین سے غفلت کا نتیجہ ہے کہ جس خطۂ ارضی پر ہم سات سو سال تک حکمران رہے وہاں ہم محکوم و مغلوب بن کر رہ گئے ہیں۔ اس احساس نے مسلم قوم کو ایک نیا شعور اور ولولہ بخشا اور اس نے اسلامی آرزوؤں اور تمناؤں کے دیئے جلا کر اُس کی روشنی میں ایک نئی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس جدوجہد

کا سب سے پہلا نتیجہ بالاکوٹ کے میدان میں رونما ہوا جہاں حضرت شاہ اسماعیل شہید اور ان کے جلیل القدر رفقاء کار کو شہادت نصیب ہوئی (اللہ تعالیٰ ان حضرات کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے)، اس کے بعد اسی احساس نے ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف صف آرا کر دیا پھر یہی احساس تحریکِ خلافت میں پوری طرح کارفرما رہا اور بالآخر اسی احساس کے تحت مسلم عوام نے پاکستان کا مطالبہ کیا اور اس کے حصول کے لیے ایسی زبردست قربانیاں دیں جن کی نظیر قومی جدوجہد میں بہت کم ملتی ہے۔ خواب و خیال کی دنیا میں رہنے والے جو چاہیں کہتے رہیں کہ پاکستان کو صرف ایک مدبر کے ناخنِ تدبیر نے جنم دیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس تدبیر کے ساتھ اگر ہندوستانی مسلمان اپنی جان و مال اور عزت و آبرو تک لٹانے کے لیے تیار نہ ہوتے تو پاکستان کا خواب ساری تدبیروں اور ہنرمندیوں کے باوجود خواب ہی رہتا شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا۔ یہ صرف اسلامی نظام کا نعرہ ہی تھا جس کی کشش نے امتِ مسلمہ کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنی قیمتی سے قیمتی متاع اس جدوجہد میں جھونک دے۔ کیا مسلمانوں کو اس بات کا علم نہ تھا کہ انتقالِ آبادی میں ان کو کس قسم کی مصیبتیں پیش آئیں گی اور سکھ اور ہندو ان کے ساتھ کس قسم کا وحشیانہ سلوک کریں گے کیا ان چار کروڑ مسلمانوں کو جو ہندو اکثریت کے علاقہ میں آباد تھے اپنا حشر معلوم نہ تھا؛ کیا انہیں اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے تہذیبی ورثہ ان کی مساجد اور ان کے مقدس مقامات کے ساتھ متعصب اور تنگ نظر اکثریت کس قسم کا شرمناک رویہ اختیار کرے گی۔ محلات میں رہنے والوں اور صرف ایوانوں میں بحث مباحثہ کرنے والوں کی آنکھوں سے یہ حقائق اوجھل ہوں تو ہوں لیکن معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا ہر مسلمان ان خوفناک نتائج سے پوری طرح آگاہ تھا۔ لیکن یہ جانتے ہوتے بھی اُس نے پاکستان کی صرف اس لیے حمایت کی کہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ میں دنیا میں رہوں یا نہ رہوں مگر اس خطۂ پاک میں اُس کی دینی تمناؤں اور روحانی آرزوؤں کی تکمیل بالضرور ہو گی۔

مملکت کے قیام تک تو وہ ہر خطرہ کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتا رہا، ہر آفت کو جرأت و مردانی سے برداشت کرتا رہا مگر جب ملک فی الواقع معرضِ وجود میں آ گیا تو اُس نے محسوس کیا کہ اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل ہونے کی بجائے اُن کا یہاں خون کیا جا رہا ہے توقعات کے جو خواب اور امیدوں کے جو خاکے اُس نے اپنے قلب و دماغ میں بنا رکھے تھے، اور جن کی اثر آفرینی کے تحت اُس نے آگ اور خون کے سمندر میں سے گزرنا تک گوارا کیا، وہ آہستہ آہستہ اُسے مٹتے ہوئے نظر آئے ـــ اُس کی حالت اس بدنصیب انسان کی سی ہے جسے پیاس نے سخت پریشان کر رکھا ہو، اور وہ لق و دق صحرا میں دُور سے پانی کا چشمہ اُبلتا ہوُا دیکھے مگر جب انتہائی محنت و مشقت اٹھانے کے بعد وہ اس چشمہ تک جا پہنچے تو اُسے معلوم ہو کہ یہ تو محض ریت کے چمکتے ہوتے ذرے ہیں جو پانی کی شکل میں اُس کے سامنے جھلملا رہے ہیں۔

آپ آج کسی محب الوطن مسلمان کے دل کو ٹٹول کر دیکھیے تو آپ اسی قسم کا احساسِ شکست اُس کے دل کی گہرائیوں میں چھپا ہوُا پائیں گے۔ یہ احساس قوموں کی زندگی میں موت اور بربادی کا پیغام ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قوم کے اندر ساری تخلیقی قوتیں ختم ہو گئی ہیں اور اُس کے سامنے سوائے کام و دہن کی لذّت کے اب کوئی اونچا مقصد باقی نہیں رہا۔ پھر اس احساس کے پرورش پانے کے ساتھ ہی اس کے اندر وہ جذبہ سرد پڑ جاتا ہے جو اُس کے مختلف افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم رکاب ہو کر چلنے کا سبق دیتا ہے۔ اس جذبہ کے مفقود ہوتے ہی ایثار، ہمدردی، جرأت و شجاعت، حق گوئی و بے باکی جیسی بلند صفات بھی مٹنے لگتی ہیں اور وہ قوم قوم نہیں رہتی بلکہ انسانوں کی ایک ایسی بھیڑ بن جاتی ہے جس کا ہر فرد خود غرضی، بے یقینی، عدمِ اعتماد اور نفس پرستی جیسی خوفناک بیماریوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ معاشرے کے اندر بھائی بھائی سے اُلجھتا ہے، حاکم محکوم سے دست و گریباں

ہوتا ہے، امراء غربا پر دستِ ظلم دراز کرتے ہیں اور غربا امراء کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں۔ الغرض ذہنی اعتبار سے اس شکست خوردہ سوسائٹی کا کوئی فرد ایسا نہیں ہوتا جسے روحانی اور جسمانی طور پر کوئی سکون حاصل ہو۔ انسانی قلب و دماغ کے ہر گوشہ میں اور معاشرے کے ہر طبقے میں ایک ایسا اختلال پیدا ہو جاتا ہے جو دنیا میں اُسے کسی کام کا نہیں چھوڑتا۔

اسے اہلِ پاکستان کی بدنصیبی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس احساسِ شکست جیسے خوفناک رجحان کا نہ صرف یہاں آغاز ہوا بلکہ اُسے بڑھانے اور ترقی دینے کے لیے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلسل انتظامات ہوتے رہے ہیں۔ اگر اہلِ ملک کو پہلے دن ہی واشگاف الفاظ میں بتا دیا جاتا کہ پاکستان کو جو احیائے اسلام کا ذریعہ بتایا گیا تھا یہ محض ایک سیاسی نعرہ تھا جس سے وقتی طور پر فائدہ اٹھانا مقصود تھا سو وہ حاصل ہو گیا ہے۔ اب ہمیں ملک کی تعمیر انہیں خطوط پر کرنی ہے جن خطوط پر مغربی قوموں نے کی ہے۔ اسلامی نظام محض قصّہ پارینہ ہے اور آج کے روشن دور میں یہ کبھی رہنما قوت نہیں بن سکتی۔" تو اس صاف گوئی سے اُن بے چاروں کے سامنے اصل عزائم کھل کر آجاتے اور وہ ایک مرتبہ سوچ سمجھ کر اپنے مستقبل کا فیصلہ کر لیتے — ان کے اندر بے یقینی اور عدمِ اعتماد کی وہ وبا نہ پھیلتی جو اس وقت اُن کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے۔ یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ جو گروہ بھی برسرِ اقتدار آتا ہے وہ پہلے اسلامی نظام کی برکات بیان کرتا ہے پھر اس امر کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس ملک میں سوائے اس نظام کے کوئی دوسرا نظام کامیاب نہیں ہو سکتا لہٰذا اسی نظام کو ہی اس خطہ میں بالادستی حاصل ہونی ہے۔ جب لوگ اس قسم کی خوش کن باتیں سنتے ہیں تو ان کے شکستہ عزائم میں پھر سے زندگی کے آثار پیدا ہوتے ہیں اور اُن کے پست حوصلے پھر بلند شروع ہوتے ہیں مگر جب وہ حقائق کی دنیا میں جھانک کر دیکھتے ہیں تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام کو برپا کرنے کے

لیے کچھ بھی نہیں کیا جا رہا اور قومی تعمیر اور ترقی کے وہی منصوبے بنائے جا رہے ہیں جو مغربی اقوام کے پیش نظر ہیں۔ اسلامی نظام کے متعلق یہ زبانی دعوے اور عملی اعتبار سے انحراف لوگوں کے اندر بار بار شکست کا احساس پیدا کرتے ہیں اور اب اس احساس نے قنوطیت اور ملکی مسائل میں عدم دلچسپی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ اہل ملک کے دلوں سے ملک کے سود و زیاں کا احساس آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے اور اُن کے کان اب ہر دعوی کو محض ایک کھوکھلے نعرے کی حیثیت سے سننے کے عادی ہو گئے ہیں۔

لوگ جب ملک کی کسی صاحب اقتدار ہستی کی زبان سے یہ سنتے ہیں کہ یہاں اسلام ہی برپا ہو گا تو وہ بجا طور پر اس چیز کی توقع رکھتے ہیں کہ اس ملک کا نظام حیات جن بنیادوں پر قائم ہے اُن میں آہستہ آہستہ تبدیلی کی جائے گی۔ غیر مسئول اقتدار کی جگہ خدا کی حاکمیت قائم ہو گی۔ امیر اور غریب، گورے اور کالے کے درمیان جو مصنوعی دیواریں حائل ہیں وہ منہدم ہوں گی۔ دولت کی غیر عادلانہ تقسیم کی بجائے ہر فرد اور طبقہ کو اس کا جائز حق ملے گا اور کوئی شخص بھی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہ ہو گا۔ معاشرتی زندگی نہایت پاکیزہ اصولوں پر مرتب ہو گی اور خانگی اور عائلی زندگی ہر قسم کی کشاکش اور غم و غصہ سے پاک ہو گی۔ پڑوسی اپنے پڑوسی سے بالکل بے خوف ہو گا۔ حسین سے حسین اور نوجوان سے نوجوان خاتون معاشرے میں اس طرح مامون زندگی بسر کرے گی کہ غیر مرد کا طائرِ وسوسہ بھی اس کے حریم عصمت کی طرف پرواز نہ کر سکے گا۔ ملک میں راستبازی، حق گوئی، نیکی اور پرہیزگاری کا عام چلن ہو گا اور برائی اپنی ہر شکل میں یہاں سے مٹا دی جائے گی۔ اسلامی نظام حیات کا نام سُن کر یہ وہ عام توقعات ہیں جو بالکل فطری طور پر ہر مسلمان کے دل و دماغ میں پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک طرف تو زبانی دعووں سے مستقبل کے متعلق یہ بلند توقعات وابستہ کی جاتی ہیں اور

دوسری طرف انہیں توقعات کو زندگی کے ہر میدان میں عملاً جھٹلایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب امت مسلمہ یہ سنتی ہے کہ اس ملک کی معاشی زندگی اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالی جائے گی تو وہ یہ سوچنے میں ہر لحاظ سے حق بجانب ہوتی ہے کہ اب ملک میں ایک ایسا معاشی نظام پروان چڑھیگا جو اشتراکیت اور سرمایہ داری کی لعنتوں سے یکسر پاک ہوگا۔ اس بنا پر پہلا احساس جو ہر فرد کے ذہن میں بالکل فطری طور پر اُبھرتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں بالکل مصنوعی طریق سے دولت کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی ہے وہ کم ہوگی اور زر و مال کو یہاں فی الواقع وہی مقام دیا جائے گا جس کا اُسے اسلام نے مستحق قرار دیا ہے دَورِ جدید میں بقول جوڈ انسانی روح صرف دولت و ثروت کے پیمانہ سے ناپی جاتی ہے، کیونکہ آج کا رب اکبر صرف ڈالر ہے۔ اس بنا پر معاشی میدان میں ہر شخص کا کعبۂ مقصود ایک ہی ہے کہ وہ حلال و حرام، جائز و ناجائز کی قیود سے یکسر آزاد ہو کر زیادہ سے زیادہ کمانے کی فکر کرے اور پھر اس سے زیادہ سے زیادہ دنیاوی فوائد حاصل کرے یہی اندازِ فکر اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں کے اندر کارفرما ہے۔ اس نقطۂ نظر کے برعکس اسلام زر و مال کی محبت کو آزمائش سے تعبیر کرتا ہے اور انسان کو یہ بنیادی حقیقت ذہن نشین کراتا ہے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے وہ بلاشبہ تمہاری خدمت و چاکری کے لیے ہے اور تمہیں اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھانا چاہیے مگر تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔ پھر قرآن مجید دورِ حاضر کی اس غلط فہمی کو بھی دور کرتا ہے کہ دولت قاضی الحاجات ہے کہ اس سے انسان کی ساری حاجتیں پوری ہو جائیں اور یہ کوئی ایسی پائیدار چیز ہے کہ اس پر ہمیشہ کے لیے تکیہ لگایا جا سکے۔ نقطۂ نظر کی اس بنیادی تبدیلی کے ساتھ ایک انسان بالکل صحیح طور پر اس بات کی توقع رکھتا ہے کہ جس معاشرے نے زر پرستی کی بجائے خدا پرستی کو اپنا اساسی اصول قرار دیا ہے اس میں دولت کمانے کے لیے وہ غیر صحتمندانہ منافقت اور رقابت نہیں ہوگی جو اس وقت ہمارے ہاں موجود ہے۔ پھر یہ نیا نظریہ ملت کو

نئی اقدار حیات عطا کرے گا جن میں شرافت اور عزت کا معیار بنک بیلنس، کوٹھیوں اور کاروں کی بجائے تقویٰ اور پرہیزگاری قرار پائے گا اور اسی کے مطابق ہر فرد کا سوسائٹی میں مرتبہ اور مقام متشخص ہو گا۔ دولت چند افراد یا ایک مخصوص طبقہ میں سکڑنے کی بجائے پوری سوسائٹی میں انصاف کے ساتھ تقسیم ہو گی اور اس طرح ہر قسم کے استحصال اور ناجائز نفع اندوزی کے راستے مسدود ہو نگے۔ اسلامی نظام معیشت کے یہ وہ قدرتی نتائج ہیں جو لازمی طور پر کچھ عرصہ کے بعد رونما ہونے چاہییں۔ لیکن اگر ایک گروہ دعوئے تو اسلامی نظامِ معیشت کا کرے لیکن سوسائٹی کا سارا ڈھانچہ سرمایہ دارانہ اصولوں کے مطابق چلتا رہے۔ ملک میں دولت کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہے، جائز و ناجائز کی ان پابندیوں کو قطعاً نظر انداز کر دیا جاتے جو اسلام نے دولت کمانے اور صرف کرنے پر عائد کر رکھی ہیں، سود جو ارتکازِ دولت کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے وہ ملک کے پورے معاشی نظام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت سے شامل رہے۔ امیر اور غریب کے درمیان زبردست تفاوت پایا جاتے۔ ملک کی بیشتر دولت پر ایک مختصر سا طبقہ دادِ عیش دیتا رہے اور عظیم اکثریت نانِ شبینہ تک سے محتاج ہو۔ ایک طرف سر بفلک عمارات تعمیر ہو رہی ہوں اور دوسری طرف لوگوں کو سر چھپانے تک کے لیے جگہ نہ ملے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر کون شخص یہ باور کر سکے گا کہ اس ملک میں اسلامی نظامِ معیشت کی راہ ہموار کی جا رہی ہے۔ اگر وہ دین کا تھوڑا سا علم بھی رکھتا ہے تو وہ یہ سمجھے گا کہ اسے محض اسلام کے نام پر دھوکا دیا جا رہا ہے اور اگر وہ علم دین سے بے بہرہ ہے تو وہ اس دین ہی کو تیاگ دے گا جو انسانوں کے درمیان اس قسم کی غیر عادلانہ تقسیم کو روا رکھتا ہے۔ یہ دونوں احساسات ملکی ترقی کے لیے کوئی فالِ نیک نہیں کہے جا سکتے۔

اسی طرح یہی ذہنی خلفشار ملک کے دستور و آئین اور اس کی سیاسی ہیئت کے متعلق ہر قدم پر پیدا ہو رہا ہے۔ ہمیں بار بار یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ملک کا دستور و آئین

اسلامی ہوگا۔ یہ ایک ایسا وعدہ ہے جس سے قوم کی مردہ تمناؤں میں بار بار زندگی کی لہر دوڑتی ہے۔ اور وہ پھر ایک بہتر اور روشن مستقبل کا خواب دیکھنا شروع کرتی ہے۔ وہ احساسِ زیاں جو گزشتہ چند سال کی وعدہ خلافیوں نے اُس کے اندر پیدا کر رکھا ہے۔ اُس کے اثرات بھی آہستہ آہستہ زائل ہونے لگتے ہیں لیکن ابھی وہ اس انداز پر سوچنا ہی شروع کرتی ہے کہ اُس کے کان میں عجیب و غریب آوازیں آنے لگتی ہیں۔ کبھی وہ سنتی ہے کہ اسلام کے غیر متبدل اصول دستور کی اساس ہوں گے۔ کبھی اسے کہا جاتا ہے کہ اسلامی روح دستور میں کارفرما ہوگی۔ کبھی اُسے یہ بتایا جاتا ہے کہ قرآن کی اٹل اور ابدی تعلیمات دستور کی بنیاد قرار پائیں گی۔ کبھی اُس کے سامنے اس امر کا انکشاف کیا جاتا ہے کہ دستور رجعت پسندانہ نہیں ہوگا بلکہ دورِ حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق ہوگا۔ یہ بھانت بھانت کی بولیاں سن کر قوم کے قلب و دماغ میں پھر شکستگی کے آثار ابھر آتے ہیں۔ اُس کے ذہن میں بالکل بجا طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان وعدوں میں قرآن مجید کی غیر متبدل تعلیمات کا تو ذکر ہے لیکن سنت جو قرآن مجید کے بعد اسلامی دستور کی سب سے محکم بنیاد ہے، اسے کیوں نظر انداز کر دیا گیا ہے اور خاص طور پر جب حکمران طبقہ کے کچھ لوگ کھلے بندوں سنت کے خلاف اظہارِ خیال شروع کر دیں تو لوگوں کے دلوں میں دستور کی اسلامی حیثیت کے بارے میں شکوک و شبہات کا پیدا ہونا بالکل ایک فطری امر ہے۔ پھر ان شکوک کو برسرِ اقتدار طبقہ کے بعض انتہائی ذمہ دار افراد کے مختلف بیانات بھی مسلسل غذا فراہم کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ جب یہ سنتے ہیں کہ مذہب انسان کی خدمت و چاکری کے لیے پیدا کیا گیا ہے نہ کہ انسان مذہب کے بندھنوں میں گرفتار رہنے کے لیے تو وہ یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ملک کی تعمیرِ جدید میں دین کی حیثیت رہنما قوت کی نہ ہوگی بلکہ تابع مہمل کی سی ہوگی جس کا کام حکمرانوں کی تمناؤں اور خواہشات کی بلا چون و چرا پیروی کرنا ہوگا۔ پھر اسلام کے غیر متبدل اصول اور اسلامی روح کا بھی جس انداز سے ذکر کیا جاتا ہے اُسے بھی کسی ہوشمند انسان کے قلب و دماغ کو یکسوئی

اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا بلکہ مزید اضطراب اور تردّد پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تو سارے احکام غیر متبدل اور ابدی ہی ہیں پھر یہاں ان کے اندر کس بنا پر تفریق کی جا رہی ہے۔ کیا اس تخصیص کا مقصد کہیں یہ تو نہیں کہ جو اصول مغربی افکار و تصورات کے مطابق نظر آئیں انہیں تو قبول کر لیا جاتے اور باقی اصولوں کو "تغیر پذیر فروعات" کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ اگر ہمارے پیشِ نظر اسلام کو ہی ملکی دستور کی اساس اور بنیاد بنانا مقصود ہے تو پھر اس امر کا کیوں نہیں صاف صاف اعتراف کر لیا جاتا کہ ملک کا دستور قرآن و سنت کے مطابق ہوگا۔ اتنی سیدھی اور واضح بات کو اتنے ایچ پیچ کے ساتھ بیان کرنے کی مصلحت ایک عام مسلمان کے ذہن میں کبھی نہیں آسکتی۔

سیاسی میدان سے ہٹ کر ہم جب معاشرتی دائرہ میں نظر ڈالتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں فکر و عمل کا یہی تضاد ہر جگہ دکھائی دیتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اس اندوہناک حقیقت کو بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے کہ اسلامی نظام کے بلند بانگ دعووں کے باوجود ہم اقدارِ حیات طے نہیں کر پاتے۔ ملک کے اندر شراب خوری، حرام خوری، زنا، فحاشی، رشوت کا بازار گرم ہے لیکن ہم ان برائیوں کو مٹانے کے لیے اتنے مضطرب نہیں جتنے کہ ہمیں فی الواقع ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہم ان برائیوں کو اُن نگاہوں سے ابھی تک دیکھنے کے عادی نہیں ہوئے جن سے اسلام انہیں دیکھتا ہے۔ ہمارے ذہنی پس منظر میں یہ برائیاں اُسی حد تک ناپسندیدہ ہیں جس حد تک کہ اہلِ مغرب انہیں قابلِ نفرت سمجھتے ہیں۔ جب امتناعِ شراب کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو اس پر غور و فکر کرتے ہوئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسے عملی جامہ پہنانے سے ہمیں کس قدر مالی خسارہ ہوگا یا ہماری اس روش سے کتنے غیر ملکی لوگ ہم سے ناراض ہوں گے۔ ایک ایسی برائی جسے اسلام انتہائی نفرت کے ساتھ دیکھتا ہے اور جس کا وجود اسلامی معاشرہ میں ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا اُس سے

اگر ہم مادی منفعت وابستہ کرلیں اور اس مسئلہ پر مادی سود و زیاں یا چند غیر ملکی افراد کی ناراضگی کے نقطۂ نظر سے غور کرنا شروع کردیں تو یقیناً اس کے بارے میں ہمارے احساسات میں وہ شدت باقی نہ رہے گی جس کا اسلام ہم سے متقاضی ہے۔ ہم اسے ایک قابلِ برداشت ناپسندیدہ فعل سمجھتے ہوئے اس سے اغماض برتتے چلے جائیں گے اور جلد ہی مجبوریوں کے نام پر اس ناپاک کاروبار کو بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے خود مواقع فراہم کریں گے۔ قریب قریب یہی حال زنا کا ہے کسی اسلامی مملکت کے لیے اس سے زیادہ شرمناک کوئی بات نہیں کہ اس کے بسنے والے اس خوفناک برائی کا ارتکاب کریں۔ اسلام کے نزدیک یہ قتلِ انسان سے زیادہ سنگین جرم ہے جس کی شریعت اسلامی میں انتہائی عبرتناک سزا مقرر کی گئی ہے۔ لیکن دیکھیے کہ اسلام کے ساتھ محبت اور عقیدت کے اظہار کے باوجود ہم اس برائی کے بارے میں کس نوعیت کے احساسات رکھتے ہیں۔ وہ برائی جس کی سزا اسلام نے سنگسار کرنا مقرر کی ہے اسے اگر چند اوباش اور آوارہ لوگ حکومت سے لائسنس حاصل کرکے فروغ دیں تو اُس کا کوئی مواخذہ نہیں کیا جاتا۔ اور اگر یہ جرم لائسنس کے بغیر کیا جائے تو پھر وہ کسی قدر قابلِ گرفت ہے۔ آپ آج کوئی اخبار اٹھا کر دیکھ لیں تو آپ کو کالم کے کالم اس گھناؤنے جرم سے بھرے ہوئے ملیں گے کیا انہیں دیکھ کر ہماری غیرت کو وہی تازیانہ لگتا ہے جو فی الواقع لگنا چاہیے۔ ہمارے اس بدنصیب معاشرہ میں روزانہ کتنی بے بس عورتیں غنڈے اور بدمعاش لوگوں کے ہاتھوں اغوا کی جاتی ہیں اور پھر اُن پر جو بیتتی ہے اُس کے تصور سے بھی جسم پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے۔ اس کے تدارک کے لیے بےشک حکومت کچھ نہ کچھ کر رہی ہے۔ کہیں پکڑ دھکڑ کا سلسلہ ہے، کہیں چھاپے مارے جارہے ہیں، کہیں ایسے مجرموں کو عدالتوں کے کٹہروں میں کھڑا کیا جارہا ہے لیکن اس معاملہ میں بھی دیکھنے کی چیز وہی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، یعنی اس جرم کی سنگینی کو ہم اُس شدت سے محسوس کرکے اس کے مطابق عمل نہیں کر رہے جس کا کہ اسلام ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔ درحقیقت ہمارے احساسات بدل گئے ہیں ہم اسے اسی طرح کی چھوٹی موٹی برائی سمجھتے ہیں جس طرح کہ دوسری

برائیاں ہیں۔ اگر سرحدوں کی حفاظت حکومت کا فرض ہے تو اس سے کہیں زیادہ اہم فرض لوگوں کی عفت اور عصمت کی پاسبانی کا بھی ہے۔ ایک اسلامی ریاست اس فرض کے معاملے میں اتنی ہی حساس ہونی چاہیے جتنی کہ وہ ملک کے قیام اور بقا کے معاملے میں ہوتی ہے اور جو افراد ملک کے اندر عفت کے قلعوں کو مسمار کرنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں وہ ان باغیوں سے کسی طرح کم نہیں جو ناپاک عزائم کے ساتھ ملک کی سرحدوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ایک مسلمان کے اس معاملے میں جذبات کتنے نازک ہوتے ہیں اُس کا اندازہ حجاج بن یوسف جیسے ظالم حکمران کے طرزِ عمل سے لگایا جاسکتا ہے۔ حجاج کے عہد میں حکومت اُن فرائض کو کما حقہٗ ادا نہ کر رہی تھی جو اسلام نے اُس پر عائد کیے ہیں۔ خود حجاج بھی کوئی خلفائے راشدین کی طرح کا کوئی خلیفۂ راشد نہ تھا، ایک آمر اور مستبد فرمانروا تھا لیکن اُسے جب اس بات کا علم ہوا کہ اُس کی قوم کی چند بیٹیاں ظالموں کے نرغے میں ہیں تو اُس نے فوراً ایک لشکرِ جرار اُن کی بازیابی کے لیے روانہ کر دیا اور اُس وقت تک چین سے نہ بیٹھا جب تک کہ انہیں آزاد کرا کر مجرموں کو کیفر کردار تک نہ پہنچا دیا۔

پھر آپ اس امر کا بھی جائزہ لیں کہ اگر ہم زنا، شراب، فحاشی اور بدکاری کا فی الواقع پاکستان میں استیصال کرنے کا عزم رکھتے ہیں تو کیا مثبت طور پر بھی ہم اس سلسلہ میں اتنا کام کر رہے ہیں جس کا یہ کام مستحق ہے۔ یہ ساری برائیاں کسی معاشرے میں یونہی نہیں پھیل جاتیں۔ ان کی پشت پر زبردست محرکات کارفرما ہوتے ہیں جو انسان کے قلب و دماغ کو اس طرف لگاتے ہیں۔ نکاح پر نار وا قسم کی پابندیاں، مردوں اور عورتوں کا آزادانہ میل جول، بے حجابی، رقص و سرود کی مجالس کا انعقاد، آرٹ اور شعر کے نام پر سفلی جذبات کی تسکین۔ یہ وہ چھوٹے چھوٹے "معصوم" فتنے ہیں جن سے ان بڑی برائیوں کو قوت و طاقت فراہم ہوتی ہے۔ اگر ان بڑی برائیوں کو مٹانا مقصود ہے تو پھر ہمارے لیے کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم ان چھوٹے چھوٹے فتنوں کو ابھارنے کی بجائے انہیں مٹانے کی فکر کریں۔ لیکن اس وقت ملک میں صورتِ حال

یہ در پیش ہے کہ ہم ان چھوٹے چھوٹے فتنوں کو "ترقی" کے نام پر پالنا بھی چاہتے ہیں اور ان کے نتیجے میں جو برائیاں پروان چڑھ رہی ہیں انہیں ختم کر دینے کے بھی متمنی ہیں۔ دنیا میں اس سے زیادہ سادہ اور بیوقوف کونسا شخص ہوگا جو اپنے مکان کو نذرِ آتش بھی کرے اور پھر اس بات کا بھی خواہشمند ہو کہ اُس کی عمارت اور اُس کے اندر جو مال و متاع موجود ہے وہ سب محفوظ رہے!

ہمارے اندازِ فکر کی بنیادی خامی وہی ہے جس کا ہم نے آغاز میں ذکر کیا تھا کہ ہم آج تک اس بات کا فیصلہ نہیں کر پاتے کہ ہماری منزلِ مقصود کیا ہے۔ اگر ہم اپنے مقصد کے بارے میں یکسو ہو جاتے تو ہمیں فکری اور عملی اعتبار سے وہ دقتیں پیش نہ آتیں جو اس وقت پیش آ رہی ہیں۔ مقصد کے یقین ہی سے زندگی میں ترتیب و تنظیم پیدا ہوتی ہے اور اس سے انسانوں کی خفتہ قوتیں بیدار ہوتی ہیں۔ مقصد ہی انسانوں کو زندگی اور اس کے معاملات کے بارے میں ایک خاص اندازِ فکر عطا کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کی زندگی کے مختلف شعبوں میں ہم رنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے طے ہو جانے کے بعد پھر اُس شخص کی ساری فکری و عملی قوتیں ایک مرکز پر جمع ہوتی ہیں اور سب سے بڑھ کر مقصد ہی کسی معاشرہ کے اندر اقدارِ حیات کی تخلیق کرتا ہے۔ ایک انسان یا سوسائٹی اپنے گردوپیش میں پھیلے ہوئے افکار و تصورات، یا افعال و اعمال یا مختلف حالات و واقعات پر جو نیک و بد، محمود و مذموم کا حکم لگاتی ہے تو اس کے لیے فتویٰ مقصد کی بارگاہ ہی سے جاری ہوتا ہے۔ یہ اقدار کسی سوسائٹی کے بقا، استحکام اور ترقی کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ نہ صرف انسان کے فکری سانچوں کو ایک خاص طرز پر ڈھالتی ہیں بلکہ اس کے احساسات و جذبات کی بھی ایک نہج پر پرورش کرتی ہیں۔ اس سے انسان اور معاشرہ کے اندر فکری اور عملی خلفشار ختم ہوتا ہے اور اس کی قوتیں ایک خاص راہ پر صرف ہونا شروع ہوتی ہیں۔ کسی قوم کا مستقبل متعین کرنے میں، اس کی ترقی اور فلاح و کامرانی کے منصوبے بنانے میں اس کی تطہیر میں یہ اقدار اساسی اہمیت کی حامل ہیں۔ وہ قوم جس نے اپنے

اندر اقدار حیات کی پورے طور پر نشوونما نہیں کی اُس کی حیثیت اُس بے لنگر جہاز کی سی ہے جسے فکر و نظر کے تھپیڑے جس طرف چاہتے ہیں بہا کر لے جاتے ہیں۔ وہ فاصلے تو بہت طے کرتا ہے لیکن منزلِ مقصود کو حاصل کرنے میں ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔

ہمارے سامنے آج سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ ہم خلوص اور ایمانداری کے ساتھ اپنی منزل کا تعین کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے مطالبہ کے وقت سے لیکر آج تک ہم مسلسل یہی دہراتے چلے آئے کہ ہمیں اس ملک کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانا ہے، یہاں صرف اسلامی نظام کو نافذ کرنا ہے لیکن اس افسوسناک حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارا عمل ہمارے ان دعووں کی تائید نہیں کرتا۔ اگر اسلام فی الواقع ہماری منزلِ مقصود ہوتا تو آج ہماری جدوجہد کا رُخ کچھ اور ہوتا۔ معاشی ترقی اور خوشحالی کے لیے آج کتنے منصوبے بن رہے ہیں اور انہیں عملی جامہ پہنانے کے لیے قوم سے کس قدر محنت اور کتنے سرمایہ کا تقاضا کیا جا رہا ہے لیکن کیا ان معاشی منصوبوں کی نسبت سے آدھی یا چوتھائی رقم یا محنت بھی اخلاقی منصوبوں کی تکمیل کے لیے صرف کی گئی ہے؟ اس معاملے میں آخر ہم کیوں اتنے بے حس ہیں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہماری نظر میں معاشی استحکام اخلاقی استحکام کی نسبت بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ حالانکہ کسی اسلامی معاشرہ میں اگر ان دو کے درمیان کبھی ترجیح کا مسئلہ پیدا ہو جائے تو اولیت کا شرف ہمیشہ اخلاق کو ہی حاصل ہوگا۔ ہم کسی ایسے معاشی استحکام کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو اخلاقی حدود و قیود کو نظر انداز کر کے حاصل کیا گیا ہو۔ اسلام دنیا کی ایک اخلاقی اور روحانی قوت ہے اور اس لیے ایک مسلمان جب تک کہ وہ مسلمان ہے ہر چیز کی قدر و قیمت اخلاقی اور روحانی معیار کے مطابق طے کرتا ہے۔ اس بنا پر خوشحالی اور بدحالی، ترقی اور تنزل کے ہمارے اپنے الگ پیمانے ہیں اور جن کے مطابق ہی ہم اپنے منصوبوں اور پروگراموں کی قدر و قیمت کا صحیح طور پر اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ضبطِ تولید یورپی اقوام کی نظر میں معیارِ زندگی بلند

کرنے کا ایک مجرب اور آسان نسخہ ہے لیکن ہمیں اس نسخہ کو آزمانے سے پہلے اس کے معاشی فوائد سے زیادہ اس کے اخلاقی مفاسد کا بھی جائزہ لینا ہے کیونکہ اگر یہ بالفرض ایک طرف ہمارا معیارِ زندگی بلند کرنے کا ذریعہ بھی ثابت ہو جاتے لیکن دوسری طرف ۔ جو ہمارے نزدیک زیادہ اہم اور ضروری ہے ۔ یہ ایسی اخلاقی بیماریوں کو جنم دے گا جو ہماری نظر میں اُس غربت اور افلاس سے کہیں زیادہ خوفناک ہیں جن سے ہمیں اس وقت خوف زدہ کیا جا رہا ہے ۔ ایک مسلمان کے ہاں ہر عمل کی اخلاقی حیثیت اس کی دوسری تمام حیثیتوں سے زیادہ وزنی ہے اور اس سے ہم کسی حالت میں بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتے ۔ یہ ایک ایسی بنیادی حقیقت ہے جو اس ملک کے کسی بھی بہی خواہ کی نظر سے کبھی بھی اوجھل نہ ہونی چاہیے کیونکہ اس کے اوجھل ہونے سے ہی ہمارے اندر فکر و عمل کا انتشار پیدا ہو رہا ہے جس سے گزشتہ چودہ سالوں میں ہمیں کافی نقصان پہنچا ہے ۔ ہم اس بات کو جتنی جلدی ذہن نشین کر لیں یہ اتنی ہی ہمارے حق میں مفید اور کارآمد ہوگی ۔

تفہیم القرآن

الاحزاب

(۲)

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

اے نبی اللہ سے ڈرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو، حقیقت میں علیم اور حکیم تو اللہ ہی ہے۔[1] پیروی کرو اُس بات کی جس کا اشارہ تمہارے رب کی طرف سے تمہیں کیا جارہا ہے

---

[1] جیسا کہ ہم اس سورہ کے دیباچے میں بیان کرچکے ہیں، یہ آیات اس وقت نازل ہوئی تھیں جب حضرت زید حضرت زینب کو طلاق دے چکے تھے۔ اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی یہ محسوس فرماتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا اشارہ بھی یہی تھا کہ منہ بولے رشتوں کے معاملہ میں جاہلیت کے رسوم و اوہام پر ضرب لگانے کا یہ ٹھیک موقع ہے، اب آپ کو خود آگے بڑھ کر اپنے منہ بولے بیٹے (زید) کی مطلقہ سے نکاح کرلینا چاہیے تاکہ یہ رسم قطعی طور پر ٹوٹ جائے۔ لیکن جس وجہ سے حضور اس معاملہ میں قدم اٹھاتے ہوئے جھجک رہے تھے وہ یہ خوف تھا کہ اس سے کفار و منافقین کو، جو پہلے ہی آپ کی پے در پے کامیابیوں سے جلے بیٹھے تھے، آپ کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لیے ایک زبردست ہتھیار مل جائے گا۔ یہ خوف کچھ اپنی بدنامی کے اندیشے سے نہ تھا، بلکہ اس بنا پر تھا کہ اس سے اسلام کو زک پہنچے گی، دشمنوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر بہت سے لوگ جو اسلام کی طرف میلان رکھتے ہیں بدگمان ہوجائیں گے، بہت سے غیر جانبدار لوگ دشمنوں میں شامل ہوجائیں گے، اور خود مسلمانوں میں بھی کمزور عقل و ذہن کے لوگ شکوک و شبہات میں پڑجائیں گے۔ اس لیے حضور یہ خیال کرتے تھے کہ جاہلیت کی ایک رسم کو توڑنے کی خاطر ایسا قدم اٹھانا خلافِ مصلحت ہے جس سے اسلام کے

اللہ ہر اُس بات سے باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو[۵]۔ اللہ پر توکل کرو، اللہ ہی وکیل ہونے کے لیے کافی ہے[۶]۔

عظیم تر مقاصد کو نقصان پہنچ جاتے۔

[۴] تقریر کا آغاز کرتے ہوئے پہلے ہی فقرے میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے اِن اندیشوں کو رفع فرما دیا۔ ارشاد کا منشا یہ ہے کہ ہمارے دین کی مصلحت کس چیز میں ہے اور کس میں نہیں ہے اس کو ہم زیادہ جانتے ہیں۔ ہم کو معلوم ہے کہ کس وقت کیا کام کرنا چاہیے اور کونسا کام خلاف مصلحت ہے۔ لہٰذا تم وہ طرزِ عمل اختیار نہ کرو جو کفار و منافقین کی مرضی کے مطابق ہو بلکہ وہ کام کرو جو ہماری مرضی کے مطابق ہو۔ ڈرنے کے لائق ہم ہیں نہ کہ کفار و منافقین۔

[۵] اس فقرے میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہے اور مسلمانوں سے بھی اور مخالفینِ اسلام سے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ نبی اگر اللہ کے حکم پر عمل کر کے بدنامی کا خطرہ مول لیگا اور اپنی عزت پر دشمنوں کے حملے صبر کے ساتھ برداشت کریگا تو اللہ سے اس کی یہ وفادارانہ خدمت چھپی نہ رہے گی۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ نبی کی عقیدت میں ثابت قدم رہیں گے اور جو شکوک و شبہات میں مبتلا ہونگے، دونوں ہی کا حال اللہ سے مخفی نہ رہے گا۔ اور کفار و منافقین اس کو بدنام کرنے کے لیے جو دوڑ دھوپ کریں گے اس سے بھی اللہ بے خبر نہ رہے گا۔ لہٰذا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہر ایک اپنے عمل کے لحاظ سے جس جزا یا سزا کا مستحق ہوگا وہ اسے مل کر رہے گی۔

[۶] اس فقرے کے مخاطب پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضورؐ کو ہدایت فرمائی جا رہی ہے کہ جو فرض تم پر عائد کیا گیا ہے اسے اللہ کے بھروسے پر انجام دو اور دنیا بھر بھی اگر مخالف ہو تو اس کی پروا نہ کرو۔ جب آدمی کو یقین کے ساتھ یہ معلوم ہو کہ فلاں حکم اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے تو پھر اسے بالکل مطمئن ہو جانا چاہیے کہ ساری خیر اور مصلحت اسی حکم کی تعمیل میں ہے۔ اس کے بعد حکمت و مصلحت دیکھنا اس شخص کا اپنا کام نہیں ہے، بلکہ اسے اللہ کے اعتماد پر صرف تعمیلِ ارشاد کرنی چاہیے۔ اللہ اس کے لیے بالکل کافی ہے کہ بندہ اپنے معاملات اُس کے ...

اللہ نے کسی شخص کے دھڑ میں دو دل نہیں رکھے ہیں[۵]، نہ اس نے تم لوگوں کی اُن بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو تمہاری ماں بنا دیا ہے[۶]، اور نہ اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا بنا یا ہے[۷]۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکال دیتے ہو، مگر اللہ وہ بات کہتا ہے جو مبنی بر حقیقت ہے، اور وہی صحیح طریقے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ

کر دے۔ وہ رہنمائی کے لیے بھی کافی ہے اور مدد کے لیے بھی، اور وہی اس امر کا ضامن بھی ہے کہ اُس کی رہنمائی میں کام کرنے والا آدمی کبھی نتائج بد سے دوچار نہ ہو۔

[۵] یعنی ایک آدمی بیک وقت مومن اور منافق، سچا اور جھوٹا، بدکار اور نیکوکار نہیں ہو سکتا اس کے سینے میں دو دل نہیں ہیں کہ ایک دل میں اخلاص ہو اور دوسرے میں بدنیتی، ایک میں انکار ہو اور دوسرے میں اقرار، ایک میں خدا کا خوف ہو اور دوسرے میں خدا سے بے خوفی۔ لہٰذا ایک وقت میں آدمی کی ایک ہی حیثیت ہو سکتی ہے۔ یا تو وہ مومن ہو گا یا منافق۔ یا تو وہ کافر ہو گا یا مسلم اب اگر تم کسی مومن کو منافق کہہ دو یا منافق کو مومن تو اس سے حقیقتِ نفس الامری نہ بدل جائیگی۔ اس شخص کی اصل حیثیت لازماً ایک ہی رہے گی۔

[۶] "ظہار" عرب کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ قدیم زمانے میں عرب کے لوگ بیوی سے لڑتے ہوئے کبھی یہ کہہ بیٹھتے تھے کہ "تیری پیٹھ میرے لیے میری ماں کی پیٹھ جیسی ہے" اور یہ بات جب کسی کے منہ سے نکل جاتی تھی تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ اب یہ عورت اس پر حرام ہو گئی ہے کیونکہ وہ اسے ماں سے تشبیہ دے چکا ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بیوی کو ماں کہنے یا ماں کے ساتھ تشبیہ دے دینے سے وہ ماں نہیں بن جاتی۔ ماں تو وہی ہے جس نے آدمی کو جنا ہے۔ محض زبان سے ماں کہہ دینا حقیقت کو نہیں بدل دیتا کہ جو بیوی تھی وہ اب تمہارے کہنے سے ماں بن جائے۔ (یہاں ظہار کے متعلق شریعت کا قانون بیان کرنا مقصود نہیں ہے اس کا قانون سورۂ مجادلہ، آیات ۲-۴ میں بیان کیا گیا ہے)۔

کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے[8]۔ اور اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں[9]۔ نادانستہ جو بات تم کہو اس کے لیے تم پر کوئی گرفت نہیں ہے، لیکن اُس بات پر ضرور گرفت ہے جس کا تم دل سے ارادہ کرو[10]۔ اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے[11]۔

---

[7] یہ اصل مقصود کلام ہے۔ اوپر کے دونوں فقرے اسی تیسری بات کو ذہن نشین کرنے کے لیے بطور دلیل ارشاد ہوئے تھے۔

[8] اس حکم کی تعمیل میں سب سے پہلے جو اصلاح نافذ کی گئی وہ یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے حضرت زید کو زید بن محمدؐ کہنے کے بجائے ان کے حقیقی باپ کی نسبت سے زید بن حارثہؓ کہنا شروع کر دیا گیا۔ بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ زید بن حارثہؓ کو پہلے سب لوگ زید بن محمدؐ کہتے تھے۔ یہ آیت نازل ہونے کے بعد انہیں زید بن حارثہؓ کہنے لگے۔ مزید برآں اس آیت کے نزول کے بعد یہ بات حرام قرار دے دی گئی کہ کوئی شخص اپنے حقیقی باپ کے سوا کسی اور کی طرف اپنا نسب منسوب کرے۔ بخاری و مسلم اور ابوداؤد نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: من ادعیٰ الیٰ غیر ابیہ وھو یعلم انہ غیر ابیہ فالجنۃ علیہ حرام۔ "جس نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے سوا کسی اور کا بیٹا کہا، درآنحالیکہ وہ جانتا ہو کہ وہ شخص اس کا باپ نہیں ہے، اس پر جنت حرام ہے"۔ اسی مضمون کی دوسری روایات بھی احادیث میں ملتی ہیں جن میں اس فعل کو سخت گناہ قرار دیا گیا ہے۔

[9] یعنی اس صورت میں بھی یہ درست نہ ہوگا کہ کسی شخص سے خواہ مخواہ اس کا نسب ملایا جائے۔

[10] مطلب یہ ہے کہ کسی کو پیار سے بیٹا کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسی طرح ماں، بیٹی، بہن، بھائی وغیرہ الفاظ بھی اگر کسی کے لیے محض اخلاقاً استعمال کر لیے جائیں تو کوئی گناہ نہیں

بلاشبہ نبی تو اہلِ ایمان کے لیے اُن کی اپنی ذات پر مقدم ہے[۱۲]، اور نبی کی بیویاں اُن کی مائیں ہیں[۱۳]، مگر کتاب اللہ کی رُو سے عام مومنین و مہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے

لیکن اس ارادے سے یہ بات کہنا کہ جسے بیٹا یا بیٹی وغیرہ کہا جائے اس کو واقعی وہی حیثیت دیدی جائے جو ان رشتوں کی ہے، اور اس کے لیے وہی حقوق ہوں جو ان رشتہ داروں کے ہیں، اور اس کے ساتھ ویسے ہی تعلقات ہوں جیسے ان رشتہ داروں کے ساتھ ہوتے ہیں، تو یہ یقیناً قابلِ اعتراض ہے اور اس پر گرفت ہوگی۔

۱۱ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ پہلے اس سلسلے میں جو غلطیاں کی گئی ہیں ان کو اللہ نے معاف کیا۔ ان پر اب کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ نادانستہ افعال پر گرفت کرنے والا نہیں ہے۔ اگر بلا ارادہ کوئی ایسی بات کی جائے جس کی ظاہری صورت ایک ممنوع فعل کی سی ہو، مگر اس میں درحقیقت اس ممنوع فعل کی نیت نہ ہو، تو محض فعل کی ظاہری شکل پر اللہ تعالیٰ سزا نہ دے ڈالے گا۔

۱۲ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مسلمانوں سے اور مسلمانوں کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو تعلق ہے وہ تمام دوسرے انسانی تعلقات سے ایک بالاتر نوعیت رکھتا ہے۔ کوئی رشتہ اُس رشتے سے اور کوئی تعلق اُس تعلق سے جو نبی اور اہلِ ایمان کے درمیان ہے، ذرہ برابر بھی کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے لیے ان کے ماں باپ سے بھی بڑھ کر شفیق و رحیم اور ان کی اپنی ذات سے بھی بڑھ کر خیر خواہ ہیں۔ ان کے ماں باپ اور ان کے بیوی بچے ان کو نقصان پہنچا سکتے ہیں، ان کے ساتھ خود غرضی برت سکتے ہیں، ان کو گمراہ کر سکتے ہیں، ان سے غلطیوں کا ارتکاب کرا سکتے ہیں، ان کو جہنم میں دھکیل سکتے ہیں، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے حق میں صرف وہی بات کرنے والے ہیں جس میں اُن کی حقیقی فلاح ہو۔ وہ خود اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مار سکتے ہیں، حماقتیں کر کے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر سکتے ہیں، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے لیے وہی کچھ تجویز کریں گے جو فی الواقع ان کے حق میں نافع ہو۔ اور جب معاملہ یہ ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی مسلمانوں پر یہ حق ہے کہ وہ آپ کو اپنے ماں باپ اور اولاد اور اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھیں، دنیا کی ہر چیز سے زیادہ آپ سے محبت رکھیں، اپنی رائے پر آپ کی رائے کو اور اپنے فیصلے پر آپ کے فیصلے کو مقدم رکھیں، اور آپ کے ہر حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں۔

اسی مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس حدیث میں ارشاد فرمایا ہے جسے بخاری و مسلم وغیرہ نے تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ روایت کیا ہے کہ لا یؤمن احدکم حتی اکون احبّ الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کو اس کے باپ اور اولاد اور تمام انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہوں"۔

سلا۔ اسی خصوصیت کی بنا پر جو اوپر مذکور ہوئی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی اپنی منہ بولی مائیں تو کسی معنی میں بھی ان کی ماں نہیں ہیں، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں اسی طرح اُن کے لیے حرام ہیں جس طرح ان کی حقیقی مائیں حرام ہیں۔ یہ مخصوص معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دنیا میں اور کسی انسان کے ساتھ نہیں ہے۔

اس سلسلے میں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف اِس معنی میں امہاتِ مومنین ہیں کہ ان کی تعظیم و تکریم مسلمانوں پر واجب ہے اور ان کے ساتھ کسی مسلمان کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ باقی دوسرے احکام میں وہ ماں کی طرح نہیں ہیں۔ مثلاً ان کے حقیقی رشتہ داروں کے سوا باقی سب مسلمان اُن کے لیے غیر محرم تھے جن سے پردہ واجب تھا۔ اُن کی صاحبزادیاں مسلمانوں کے لیے ماں جائی بہنیں نہ تھیں کہ ان سے بھی مسلمانوں کا نکاح ممنوع ہوتا۔ اُن کے بھائی بہن مسلمانوں کے لیے خالہ اور ماموں کے حکم میں نہ تھے۔ ان سے کسی غیر رشتہ دار مسلمان کو وہ میراث نہیں پہنچتی تھی جو ماں سے پہنچتی ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ قرآن مجید کی رُو سے یہ مرتبہ تمام ازواجِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے جن میں لامحالہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی شامل ہیں لیکن ایک گروہ نے جب حضرت علیؓ و فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کی اولاد کو مرکزِ دین بنا کر سارا نظامِ دین انہی کے گرد گھما دیا، اور اس بنا پر دوسرے بہت سے صحابہ کے ساتھ حضرت عائشہؓ کو بھی ہدفِ لعن و طعن بنایا، تو ان کی راہ میں قرآن مجید کی یہ آیت حائل ہو گئی جس کی رُو سے ہر اُس شخص کو انہیں اپنی ماں تسلیم کرنا پڑتا ہے جو ایمان کا مدعی ہو۔ آخر کار اس مشکل کو رفع کرنے کے لیے یہ عجیب و غریب دعویٰ کیا گیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی ازواجِ مطہرات میں سے جس کو چاہیں آپؐ کی زوجیت پر باقی

کے زیادہ حق دار ہیں، البتہ اپنے رفیقوں کے ساتھ تم کوئی بھلائی (کرنا چاہو تو) کر سکتے ہو۔[۱۴] یہ حکم کتابِ الٰہی میں لکھا ہوا ہے۔

رکھیں اور جسے چاہیں آپ کی طرف سے طلاق دے دیں، چنانچہ جنگ جمل کے بعد انہوں نے حضرت عائشہؓ کو طلاق دے دی تھی، لہٰذا اب وہ ام المومنین نہیں ہیں۔ ابو منصور احمد بن ابی طالب طبرسی نے کتاب الاحتجاج میں یہ بات لکھی ہے اور سلیمان بن عبداللہ البحرانی نے اسے نقل کیا ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا یا اباالحسن ان ھٰذا الشرف باق ما دمنا علی طاعۃ اللّٰہ تعالٰی فایتھن عصت اللّٰہ تعالٰی بعدی بالخروج علیک فطلقھا من الازواج واسقطھا من شرف امھات المومنین (اے ابوالحسن، یہ شرف تو اسی وقت تک باقی ہے جب تک ہم لوگ اللہ کی اطاعت پر قائم رہیں۔ لہٰذا میری بیویوں میں سے جو بھی میرے بعد تیرے خلاف خروج کرکے اللہ کی نافرمانی کرے اسے تو طلاق دے دیجیو اور اس کو امہات المومنین کے شرف سے ساقط کر دیجیو)۔ اصولِ روایت کے اعتبار سے تو یہ روایت سراسر بے اصل ہے ہی، لیکن اگر آدمی محض عقل ہی سے کام لے کر اس کے مضمون پر غور کرے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ انتہائی لغو، اور رسولِ پاک کے حق میں سخت توہین آمیز افترا ہے۔ رسول کا مقام تو بہت بالاتر و برتر ہے، ایک معمولی شریف آدمی سے بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی وفات کے بعد اپنی بیوی کو طلاق دینے کی فکر کرے گا اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت اپنے داماد کو یہ اختیار دے جائے گا کہ اگر کبھی تیرا اس کے ساتھ جھگڑا ہو تو میری طرف سے تو اس کو طلاق دے دیجیو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اہل البیت کی محبت کے مدعی ہیں ان کے دلوں میں صاحب البیت کی عزت و ناموس کا پاس کتنا کچھ ہے، اور اس سے بھی گزر کر خود اللہ تعالٰی کے ارشادات کا وہ کتنا احترام کرتے ہیں۔

[۱۴] اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ ہے، اُن کے ساتھ تو مسلمانوں کے تعلق کی نوعیت سب سے الگ ہے۔ لیکن عام مسلمانوں کے درمیان آپس کے تعلقات اس اصول پر قائم ہوں گے کہ رشتہ داروں کے حقوق ایک دوسرے پر عام لوگوں کی بہ نسبت مقدم ہیں،

اور (اے نبی)، یاد رکھو اُس عہد و پیمان کو جو ہم نے سب پیغمبروں سے لیا ہے، تم سے بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی۔ سب سے ہم پختہ عہد لے چکے ہیں[۱۵]۔

کوئی خیرات اس صورت میں صحیح نہیں ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ، بال بچوں، اور بھائی بہنوں کی ضروریات تو پوری نہ کرے اور باہر خیرات کرتا پھرے۔ زکوٰۃ سے بھی آدمی کو پہلے اپنے غریب رشتہ داروں کی مدد کرنی ہوگی، پھر وہ دوسرے مستحقین کو دیگا۔ میراث لازماً اُن لوگوں کو پہنچے گی جو رشتے میں آدمی سے قریب تر ہوں۔ دوسرے لوگوں کو اگر وہ چاہے تو ہبہ یا وقف یا وصیت کے ذریعہ سے اپنا مال دے سکتا ہے، مگر اس طرح نہیں کہ وارث محروم رہ جائیں اور سب کچھ دوسروں کو دے ڈالا جائے۔ اِس حکم الٰہی سے وہ طریقہ بھی موقوف ہو گیا جو ہجرت کے بعد مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ قائم کرنے سے شروع ہوا تھا جس کی رو سے محض دینی برادری کے تعلق کی بنا پر مہاجرین اور انصار ایک دوسرے کے وارث ہونے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے صاف فرما دیا کہ وراثت تو رشتہ داری کی بنا پر ہی تقسیم ہوگی، البتہ ایک شخص ہدیے، تحفے، یا وصیت کے ذریعہ سے اپنے کسی دینی بھائی کی کوئی مدد کرنا چاہے تو کر سکتا ہے

۱۵ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات یاد دلاتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح آپ سے بھی اللہ تعالیٰ ایک پختہ عہد لے چکا ہے جس کی آپ کو سختی کے ساتھ پابندی کرنی چاہیے۔ اس عہد سے کون سا عہد مراد ہے؟ اوپر سے جو سلسلۂ کلام چلا آرہا ہے اس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد یہ عہد ہے کہ پیغمبر اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی خود اطاعت کرے گا اور دوسروں سے کرائے گا، اللہ کی باتوں کو بے کم و کاست پہنچائے گا اور انہیں عملاً نافذ کرنے کی سعی و جہد میں کوئی دریغ نہ کرے گا۔ قرآن مجید میں اس عہد کا ذکر متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ	اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا تمہارے لیے وہ دین جس
نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖ	کی ہدایت کی تھی اس نے نوح کو، اور جس کی وحی کی گئی

اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (الشوریٰ۔ آیت ۱۳)

(اے محمدؐ، تمہاری طرف، اور جس کی ہدایت کی گئی ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو۔ اس تاکید کے ساتھ کہ تم لوگ قائم کرو اس دین کو اور اس میں تفرقہ نہ کرو)

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ (آل عمران ۔ ۱۸۷)

اور یاد کرو اس بات کو کہ اللہ نے عہد لیا تھا ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی تھی کہ تم لوگ اس کی تعلیم کو بیان کرتے رہو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۔ (البقرہ ۔ ۸۳)

اور یاد کرو کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو گے۔

اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ ... خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۔ (الاعراف ۔ آیات ۱۶۹ ۔ ۱۷۱)

کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا گیا تھا؟ . . . مضبوطی کے ساتھ تھامو اس چیز کو جو ہم نے تمہیں دی ہے اور یاد رکھو اس ہدایت کو جو اس میں ہے توقع ہے کہ تم اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو گے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۔ (المائدہ ۔ ۷)

اور اے مسلمانو، یاد رکھو اللہ کے اس احسان کو جو اس نے تم پر کیا ہے اور اس عہد کو جو اس نے تم سے لیا ہے جبکہ تم نے کہا "ہم نے سنا اور اطاعت کی"۔

اس عہد کو اس سیاق و سباق میں اللہ تعالیٰ جس وجہ سے یاد دلا رہا ہے وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شماتتِ اعداء کے اندیشے سے منہ بولے رشتوں کے معاملہ میں جاہلیت کی رسم کو توڑتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ آپ کو بار بار یہ شرم لاحق ہو رہی تھی کہ معاملہ ایک خاتون سے شادی کرنے کا ہے۔ میں خواہ کتنی ہی نیک نیتی کے ساتھ محض اصلاحِ معاشرہ کی خاطر یہ کام کروں، مگر دشمن یہی کہیں گے کہ یہ کام دراصل نفس پرستی کی خاطر کیا گیا ہے اور مصلح کا لبادہ اس شخص نے محض فریب دینے کے لیے اوڑھ رکھا ہے۔

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ حضورؐ سے فرما رہا ہے کہ تم ہمارے مقرر کیے ہوئے پیغمبر ہو، تمام پیغمبروں کی طرح تم سے بھی ہمارا یہ پختہ معاہدہ ہے کہ جو کچھ بھی حکم ہم دینگے اس کو خود بجا لاؤ گے اور دوسروں کو اس کی پیروی کا حکم دو گے، لہٰذا تم کسی کے طعن و تشنیع کی پروا نہ کرو، کسی سے شرم اور خوف نہ کرو، اور جو خدمت ہم تم سے لینا چاہتے ہیں اسے بلا تامل انجام دو۔

ایک گروہ اِس میثاق سے وہ میثاق مراد لیتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے تمام انبیاء اور ان کی امتوں سے اس بات کے لیے لیا گیا تھا کہ وہ بعد کے آنے والے نبی پر ایمان لائیں گے اور اس کا ساتھ دیں گے۔ اِس تاویل کی بنیاد پر اس گروہ کا دعویٰ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی نبوت کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور حضورؐ سے بھی یہ میثاق لیا گیا ہے کہ آپ کے بعد جو نبی آئے آپ کی امت اس پر ایمان لائے گی۔ لیکن آیت کا سیاق و سباق صاف بتا رہا ہے کہ یہ تاویل بالکل غلط ہے۔ جس سلسلۂ کلام میں یہ آیت آئی ہے اُس میں یہ کہنے کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے کہ آپ کے بعد بھی انبیاء آئیں گے اور آپ کی امت کو ان پر ایمان لانا چاہیے۔ یہ مفہوم اس کا لیا جائے تو یہ آیت یہاں بالکل بے جوڑ اور بے محل ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں آیت کے الفاظ میں کوئی صراحت ایسی نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ یہاں میثاق سے کونسا میثاق مراد ہے۔ لامحالہ اس کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے ہم کو قرآن مجید کے دوسرے مقامات کی طرف رجوع کرنا ہو گا جہاں انبیاء سے لیے ہوئے مواثیق کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب اگر سارے قرآن میں صرف ایک ہی میثاق کا ذکر ہوتا اور وہ بعد کے آنے والے انبیاء پر ایمان لانے کے بارے میں ہوتا تو یہ خیال کرنا درست ہوتا کہ یہاں بھی میثاق سے مراد وہی میثاق ہے۔ لیکن قرآن پاک کو جس شخص نے بھی کبھی آنکھیں کھول کر پڑھا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کتاب میں بہت سے میثاقوں کا ذکر ہے جو انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں سے لیے گئے ہیں۔ لہٰذا ان مختلف مواثیق میں سے وہ میثاق یہاں مراد لینا صحیح ہو گا جو اس سیاق و سباق سے مناسبت رکھتا ہو، نہ کہ وہ میثاق جس کے ذکر کا یہاں کوئی موقع نہ ہو۔ اسی طرح کی غلط تاویلوں سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ بعض لوگ قرآن سے ہدایت لینے نہیں بیٹھتے بلکہ آتے ہیں اپنے دیے سمجھ بانٹنے ہیں۔

تاکہ سچے لوگوں سے (ان کا رب) ان کی سچائی کے بارے میں سوال کرے[۱۶]، اور کافروں کے لیے تو اس نے دردناک عذاب مہیا کر ہی رکھا ہے[۱۷] ع

اے[۱۸] لوگو جو ایمان لائے ہو، یاد کرو اللہ کے اُس احسان کو جو (ابھی ابھی) اُس نے تم پر کیا ہے۔ جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں[۱۹]۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے۔ جب وہ اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے[۲۰]، جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے منہ کو آ گئے، اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اُس

---

۱۶ یعنی اللہ تعالیٰ محض عہد لے کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ اس عہد کے بارے میں وہ سوال کرنے والا ہے کہ اس کی کہاں تک پابندی کی گئی۔ پھر جن لوگوں نے سچائی کے ساتھ اللہ سے کیے ہوئے عہد کو وفا کیا ہو گا وہی صادق العہد قرار پائیں گے۔

۱۷ اس رکوع کے مضمون کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو آیات ۲۶۔۴۸ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے۔

۱۸ یہاں سے رکوع ۳ کے آخر تک کی آیات اُس وقت نازل ہوئی تھیں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بنی قریظہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ ان دونوں رکوعوں میں غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنی قریظہ کے واقعات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ان کو پڑھتے وقت ان دونوں غزوات کی وہ تفصیلات نگاہ میں رہنی چاہییں جو ہم دیباچے میں بیان کر آئے ہیں۔

۱۹ یہ آندھی اُسی وقت نہیں آ گئی تھی جبکہ دشمنوں کے لشکر مدینے پر چڑھ کر آئے تھے بلکہ اُس وقت آئی تھی جب محاصرے کو تقریباً ایک مہینہ گزر چکا تھا۔ نظر نہ آنے والی فوجوں سے مراد وہ مخفی طاقتیں ہیں جو انسانی معاملات میں اللہ تعالیٰ کے اشارے پر کام کرتی رہتی ہیں اور انسانوں کو ان کی خبر تک نہیں ہوتی۔ انسان واقعات و حوادث کو صرف ان کے ظاہری اسباب پر محمول کرتا ہے۔ لیکن اندر ہی اندر غیر محسوس طور پر جو قوتیں کام کرتی ہیں وہ اس کے حساب میں

وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے۔[۲۱]
یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا
صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے ہم سے کیے تھے
وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے[۲۲]۔ جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ "اے یثرب کے
لوگو، تمہارے لیے اب ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، پلٹ چلو[۲۳]"۔ جب ان کا ایک
فریق یہ کہہ کر نبی سے رخصت طلب کر رہا تھا کہ "ہمارے گھر خطرے میں ہیں[۲۴]"، حالانکہ وہ

نہیں آتیں، حالانکہ اکثر حالات میں انہی مخفی طاقتوں کی کارفرمائی فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے۔ یہ
طاقتیں چونکہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کی ماتحتی میں کام کرتی ہیں اس لیے "فوجوں" سے مراد فرشتے
بھی لیے جا سکتے ہیں اگرچہ یہاں فرشتوں کی فوجیں بھیجنے کی صراحت نہیں ہے۔

۲۰؎ اس کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہر طرف سے چڑھ آئے۔ اور دوسرا مطلب
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نجد اور خیبر سے چڑھ کر آنے والے اوپر سے آئے، اور مکہ معظمہ کی طرف سے
آنے والے نیچے سے آئے۔

۲۱؎ ایمان لانے والوں سے مراد یہاں وہ سب لوگ ہیں جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ
وسلم کو اللہ کا رسول مان کر اپنے آپ کو حضورؐ کے پیروؤں میں شامل کیا تھا، جن میں سچے
اہل ایمان بھی شامل تھے اور منافقین بھی۔ اس پیراگراف میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے گروہ
کا مجموعی طور پر ذکر فرما رہا ہے۔ اس کے بعد کے دو پیراگرافوں میں منافقین کی روش پر
تبصرہ کیا گیا ہے۔ پھر آخر کے دو پیراگراف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین صادقین کے بارے میں ہیں۔

۲۲؎ یعنی اس امر کے وعدے کہ اہلِ ایمان کو اللہ کی تائید و نصرت حاصل ہو گی اور آخرکار غلبہ انہی کو
بخشا جائے گا۔

۲۳؎ اس فقرے کے دو مطلب ہیں۔ ظاہری مطلب یہ ہے کہ خندق کے سامنے
کفار کے مقابلے پر ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، شہر کی طرف پلٹ چلو، اور باطنی مطلب یہ ہے کہ

خطرے میں نہ تھے[۲۵]، دراصل وہ محاذِ جنگ سے، بھاگنا چاہتے تھے۔ اگر شہر کے اطراف سے دشمن گھس آئے ہوتے اور اُس وقت اِنہیں فتنے کی طرف دعوت دی جاتی[۲۶] تو یہ اس میں جا پڑتے اور مشکل ہی سے انہیں شریکِ فتنہ ہونے میں کوئی تامل ہوتا۔ ان لوگوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا کہ یہ پیٹھ نہ پھیریں گے، اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کی

اسلام پر ٹھیرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، اب اپنے آبائی مذہب کی طرف پلٹ جانا چاہیے تاکہ سارے عرب کی دشمنی مول لیکر ہم نے جس خطرے میں اپنے آپ کو ڈال دیا ہے اُس سے بچ جائیں۔ منافقین اپنی زبان سے اس طرح کی باتیں اس لیے کہتے تھے کہ جو ان کے دام میں آسکتا ہو اس کو تو اپنا باطنی مطلب سمجھا دیں، لیکن جو ان کی بات سُن کر چوکنا ہو اور اس پر گرفت کرے اس کے سامنے اپنے ظاہر الفاظ کی آڑ لے کر گرفت سے بچ جائیں۔

[۲۴] یعنی جب بنو قریظہ بھی حملہ آوروں کے ساتھ مل گئے تو ان منافقین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر سے نکل بھاگنے کے لیے ایک اچھا بہانہ ہاتھ آگیا اور انہوں نے یہ کہہ کر رخصت طلب کرنی شروع کی کہ اب تو ہمارے گھر ہی خطرے میں پڑ گئے ہیں، للہذا ہمیں جاکر اپنے بال بچوں کی حفاظت کرنے کا موقع دیا جائے۔ حالانکہ اُس وقت سارے اہلِ مدینہ کی حفاظت کے ذمہ دار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ بنی قریظہ کی بدعہدی سے جو خطرہ بھی پیدا ہوا تھا اس سے شہر اور اس کے باشندوں کو بچانے کی تدبیر کرنا حضورؐ کا کام تھا نہ کہ فوج کے ایک ایک فرد کا۔

[۲۵] یعنی اس خطرے سے بچاؤ کا انتظام تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کر چکے تھے۔ یہ انتظام بھی دفاع کی اُس مجموعی اسکیم ہی کا ایک حصہ تھا جس پر سالارِ لشکر کی حیثیت سے حضور عمل فرما رہے تھے اس لیے کوئی فوری خطرہ اُس وقت درپیش نہ تھا جس کی بنا پر ان کا یہ عذر کسی درجے میں بھی معقول ہوتا۔

[۲۶] یعنی شہر جب داخل ہو کر فاتح کفار ان منافقین کو دعوت دیتے کہ آؤ ہمارے ساتھ

باز پُرس تو ہونی ہی تھی ؀۲۷۔

اَے نبی، ان سے کہو، اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمہارے لیے کچھ بھی نفع بخش نہ ہوگا۔ اس کے بعد زندگی کے مزے لوٹنے کا تھوڑا ہی موقع تمہیں مل سکے گا۔ ؀۲۸ اِن سے کہو، کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکتا ہو اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے؟ اور کون اس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر وہ تم پر مہربانی کرنا چاہے؟ اللہ کے مقابلے میں تو یہ لوگ کوئی حامی و مددگار نہیں پا سکتے۔

اللہ تم میں سے ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو (جنگ کے کام میں) رکاوٹیں ڈالنے والے ہیں، جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ "آؤ ہماری طرف" ؀۲۹ جو لڑائی میں حصہ لیتے بھی ہیں تو بس نام گنانے کو، جو تمہارا ساتھ دینے میں سخت بخیل ہیں ؀۳۰۔ خطرے کا وقت

مل کر مسلمانوں کو ختم کردو۔

۲۷؎ یعنی جنگ اُحد کے موقع پر جو کمزوری انہوں نے دکھائی تھی اس کے بعد شرمندگی و ندامت کا اظہار کر کے ان لوگوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اب اگر آزمائش کا کوئی موقع پیش آیا تو ہم اپنے اس قصور کی تلافی کر دیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو محض باتوں سے دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ جو شخص بھی اُس سے کوئی عہد باندھتا ہے اُس کے سامنے کوئی نہ کوئی آزمائش کا موقع وہ ضرور لے آتا ہے تاکہ اس کا جھوٹ سچ کھل جائے۔ اس لیے وہ جنگِ اُحد کے دو ہی سال بعد اُس سے بھی زیادہ بڑا خطرہ سامنے لے آیا اور اُس نے جانچ کر دیکھ لیا کہ اِن لوگوں نے کیسا کچھ سچا عہد اُس سے کیا تھا۔

۲۸؎ یعنی اِس فرار سے کچھ تمہاری عمر بڑھ نہیں جائے گی۔ اس کا نتیجہ بہرحال یہ نہیں ہوگا کہ تم قیامت تک جیو اور روئے زمین کی دولت پا لو۔ بھاگ کر بھی جیو گے تو زیادہ سے زیادہ چند سال ہی جیو گے اور اتنا ہی کچھ دنیا کی زندگی کا لطف اٹھا سکو گے جتنا تمہارے لیے مقدر ہے۔

۲۹؎ یعنی چھوڑو اس پیغمبر کا ساتھ۔ کہاں دین و ایمان اور حق و صداقت کے چکر میں پڑے ہو۔ اپنے

آجائے تو اس طرح دیدے پھرا پھرا کر تمہاری طرف دیکھتے ہیں جیسے کسی مرنے والے پر غشی طاری ہو رہی ہو، مگر جب خطرہ گزر جاتا ہے تو یہی لوگ فائدوں کے حریص بن کر قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبانیں لیے تمہارے استقبال کو آجاتے ہیں[۳۱]۔ یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لائے[۳۲]، اسی لیے اللہ نے ان کے سارے اعمال ضائع کر دیئے[۳۳]، اور ایسا کرنا اللہ کے لیے

آپ کو خطرات اور مصائب میں مبتلا کرنے کے بجائے وہی عافیت کوشی کی پالیسی اختیار کرو جو ہم نے اختیار کر رکھی ہے۔

۳۰ یعنی اپنی محنتیں، اپنے اوقات، اپنی فکر، اپنے مال، غرض کوئی چیز بھی وہ اُس راہ میں صرف کرنے کے لیے بخوشی تیار نہیں ہیں جس میں مومنین صادقین اپنا سب کچھ جھونکے دے رہے ہیں۔ جان کھپانا اور خطرے انگیز کرنا تو بڑی چیز ہے، وہ کسی کام میں بھی کھلے دل سے اہل ایمان کا ساتھ نہیں دینا چاہتے۔

۳۱ لغت کے اعتبار سے اس آیت کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ لڑائی سے جب تم کامیاب پلٹتے ہو تو وہ بڑے تپاک سے تمہارا استقبال کرتے ہیں اور چرب زبانی سے کام لے کر یہ دھونس جمانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم بھی بڑے مومن ہیں اور ہم نے بھی اس کام کو فروغ دینے میں حصہ لیا ہے، لہٰذا ہم بھی مالِ غنیمت کے حق دار ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر فتح نصیب ہوتی ہے تو مالِ غنیمت کی تقسیم کے موقع پر یہ لوگ زبان کی بڑی تیزی دکھاتے ہیں اور بڑھ بڑھ کر مطالبے کرتے ہیں کہ لاؤ ہمارا حصہ، ہم نے بھی خدمات انجام دی ہیں، سب کچھ تم ہی لوگ نہ لوٹ لے جاؤ۔

۳۲ یعنی اسلام قبول کرنے کے بعد جو نمازیں انہوں نے پڑھیں، جو روزے رکھے، جو زکوٰتیں دیں، اور بظاہر جو نیک کام بھی کیے ان سب کو اللہ تعالیٰ کالعدم قرار دے دیگا اور ان کا کوئی اجر انہیں نہ دیگا۔ کیونکہ اللہ کے ہاں فیصلہ اعمال کی ظاہری شکل پر نہیں ہوتا بلکہ یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ اس ظاہر کی تہہ میں ایمان اور خلوص ہے یا نہیں۔ جب یہ چیز سرے سے ان کے اندر موجود ہی نہیں ہے تو یہ دکھاوے کے اعمال سراسر بے معنی ہیں۔ اس مقام پر یہ امر گہری توجہ کا طالب ہے کہ جو لوگ

بہت آسان ہے۔[۳۲] یہ سمجھ رہے ہیں کہ حملہ آور گروہ ابھی گئے نہیں ہیں۔ اور اگر وہ پھر حملہ آور ہو جائیں تو ان کا جی چاہتا ہے کہ اُس موقع پر یہ کہیں صحرا میں بدوؤں کے درمیان جا بیٹھیں اور وہیں سے تمہارے حالات پوچھتے رہیں۔ تاہم اگر یہ تمہارے درمیان رہے بھی تو لڑائی میں کم ہی حصہ لیں گے ؏ ۲ع

اللہ اور رسول کا اقرار کرتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے۔ روزے رکھتے تھے، زکوٰۃ بھی دیتے تھے، اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے دوسرے نیک کاموں میں بھی شریک ہوتے تھے، ان کے بارے میں صاف صاف فیصلہ دے دیا گیا ہے کہ یہ سرے سے ایمان لائے ہی نہیں۔ اور یہ فیصلہ صرف اِس بنیاد پر دیا گیا ہے کہ کفر اور اسلام کی کشمکش میں جب کڑی آزمائش کا وقت آیا تو انہوں نے دوغلے پن کا ثبوت دیا، دین کے مفاد پر اپنے مفاد کو ترجیح دی، اور اسلام کی حفاظت کے لیے جان، مال اور محنت صرف کرنے میں دریغ کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فیصلے کا اصل مدار یہ ظاہری اعمال نہیں ہیں، بلکہ یہ سوال ہے کہ آدمی کی وفاداریاں کس طرف ہیں۔ جہاں خدا اور اس کے دین سے وفاداری نہیں ہے وہاں اقرار ایمان اور عبادات اور دوسری نیکیوں کی کوئی قیمت نہیں۔

[۳۲] یعنی ان کے اعمال کوئی وزن اور قیمت نہیں رکھتے کہ ان کو ضائع کر دینا اللہ کو گراں گزرے اور یہ لوگ کوئی زور نہیں رکھتے کہ ان کے اعمال کو ضائع کرنا اُس کے لیے دشوار ہو۔

مطلق العنان اقتدار کے تحت مجلد و مذہبی مناصب

(جناب نعیم صدیقی صاحب)

(۴)

حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میری جماعت کے دو ایسے گروہ ہیں کہ وہ مستقیم رہیں گے تو ساری جماعت درست رہے گی، وہ بگڑیں گے تو تمام لوگ بگڑ جائیں گے ---- وہ ہیں امراء اور فقہاء"[1]

اور جس دور کا مطالعہ ہم کر رہے ہیں اس میں قیادت کی ان دو صفوں میں سے ایک بگڑ چکی تھی۔ اگر دونوں بگاڑ کا شکار ہو گئی ہوتیں تو ملت میں کوئی خیر و فلاح باقی نہ رہتی بلکہ بعید نہ تھا کہ عملی خرابیوں کے ساتھ ساتھ ایمان و افکار کی دنیا بھی اجڑ جاتی اور آج نظام اسلامی کے کھنڈر ملبے کے انباروں میں اس طرح مدفون پڑے ہوتے کہ یہی سراغ لگانا مشکل ہو جاتا کہ کن بنیادوں پر یہ نظام اٹھایا گیا تھا اور اس کی نوعیت فی الحقیقت کیا تھی۔ مگر جہاں ملت پر یہ مصیبت آئی کہ اس کی سیاسی قیادت غلط راستے پر پڑ گئی وہاں قرآن اور حضورؐ کی واضح پیشین گوئی کے مطابق اس پر خدا کا یہ کرم بہرحال رہا کہ اس کی علمی قیادت بہ حیثیت مجموعی راست رو رہی۔ اسلام کے اصول و اقدار تاریخ کے میدان میں جب بدلتے حالات اور نت نئے بیرونی اثرات سے دوچار ہوتے تو خلافت راشدہ کے مضبوط کارپردازوں کے بعد سیاسی اقتدار ان حالات و اثرات کے سامنے جھک گیا بلکہ ان کا آلہ کار بن گیا، مگر دوسری طرف علم و فکر کی عنانِ قیادت سنبھالنے والے ہاتھ اتنے مضبوط تھے کہ انہوں نے اسلام کے اصول و اقدار کے دفاع کی لڑائی مزاحم ہونے والے حالات و اثرات کے خلاف بڑی بے جگری سے لڑی اور اس لڑائی میں انہوں نے اپنوں کے سیاسی اقتدار کے خنجر

[1] احیاء العلوم از حضرت امام غزالی، ج ۱، ص ۶۔

خون ریز کے وار بھی ہنستے مسکراتے برداشت کیے۔ پہلا عنصر "تو بازمانہ بساز" کا قائل تھا اور دوسرا "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز" پر عمل پیرا۔ وہ تاریخ کے دھارے کے ساتھ بہنا چاہتا تھا اور یہ تاریخ کی موجوں پر کمان کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے بطورِ خود ایسی رو دگاہ بنانے کا داعی تھا جو اسلام کے اصول و اقدار کے مطابق ہو۔ اول الذکر اسلام کو حالات بلکہ اپنے بدلتے تصورات و رجحانات کے سانچے میں ڈھالنے کی سہل راہ کو پسند کرتا تھا اور موخر الذکر حالات کے تقاضوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے ساعی تھا۔ یہی دوسرا مبارک عنصر ہے جس کی خدمات کے طفیل اسلام کے اعتقادات، اس کے اصول، اس کے اخلاقی تصورات، اس کا قانون، اس کا نظامِ معاشرت اور اس کا پورا عالمِ افکار ہم تک صحیح و سلامت پہنچ سکا ہے۔ ملت کے سرمایۂ وجود کو اس کے اپنے ہی خنجرِ بے باک سے اگر بچایا ہے تو اس کے قلمِ حق رقم نے بچایا ہے۔

گویا ہماری تاریخ کا سیاسی دھارا اگر قصر و محلات سے ہو کر مصلحت پرستی کی رودگاہ میں بہا ہے تو اس کا فکری دھارا مسجدوں اور حجروں اور مدرسوں بلکہ بسا اوقات قید خانوں اور مقتلوں سے گزرتا ہوا حق پرستی اور اصول پسندی کی وادیوں میں بہتا رہا ہے۔ قیادت کی ان دو صفوں میں سے بگڑنے والی سیاسی صف کو ہر ہر قدم پر فکری صف کی طرف سے کشمکش کا سامنا کرنا پڑا اور اگر خدانخواستہ یہ فکری مزاحمت بھی نہ ہوئی ہوتی تو کون اندازہ کرسکتا ہے کہ مطلق العنان اقتدار اور آگے کہاں تک جا پہنچا ہوتا۔

اس کشمکش کی ایمان افروز اور عبرت آموز داستان ہماری پوری تاریخ میں پھیلی ہوئی ہے اور اسی کا ایک باب ہم یہاں سامنے لا رہے ہیں۔

تسخیرِ علماء کی مہم کا "ردِ عمل" ہم بیان کرچکے ہیں کہ موروثی بادشاہت کے تخت پر جب مطلق العنان اقتدار جلوہ گر ہوا تو اس کی فطری اور نہایت موثر ضرورت کے تحت وہ مجبور تھا کہ علماء اور خصوصاً قانون و فقہ کے ماہرین کا تعاون اپنے لیے حاصل کرے۔ ہم یہ بھی بیان کرچکے ہیں کہ اموی دور ہی سے حکومت کی یہ پالیسی طے پا گئی تھی کہ علماء — خصوصاً عوام میں اثر و اعتماد رکھنے

والے علماء — کو سرکاری مناصب پر لایا جائے۔ اس پالیسی کے تحت اموی دور سے جو مہم شروع ہوئی تھی وہ عباسی دور میں اور بھی زور سے چلی۔ مناصب کا ریشمی جال بچھا کر اور عطایا کے زریں دانے بکھیر کر صیاد سیاسی فن تزویر کی کمین گاہ میں منتظر بیٹھ گیا کہ یہ جو اڑتی چہکتی چڑیاں رونق فضا ہیں، پلک جھپکنے میں اس کے فتراک میں ہوں گی۔ مگر جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ چوگ پر مرنے والی چڑیاں نہیں ہیں، عقاب اور شاہین ہیں جن کی من بھاتی غذا فاقہ ہے۔ علمائے حق اپنی نگاہوں میں اتنے کم قیمت نہ تھے کہ ایک عہدے اور ایک تنخواہ یا وظیفے کے عوض اپنی متاعِ علم و ضمیر کو بیچ ڈالیں۔

مبین حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم
شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

ان کے سامنے عہدہ و جاہ، خلعتوں اور انعامات اور اندھے مسرفانہ عطایا کی گنگا بہ رہی تھی مگر انہوں نے فقر کے میکدے میں اپنے جامِ تہی کو ہمیشہ غیرتِ ایمانی ہی کی مے سے بھرا اور تشنہ لبی ہی سے سرور حاصل کیا۔

ہمیں تو پیاس بھی، ساقی: سرور دیتی رہی
ذرا غیور ہیں، خالی ایاغ رکھتے ہیں

ان کا علم ان کے لیے بجائے خود ایک سلطنت تھا۔ اس سلطنت کا اصل خزانہ ضمیر کی آزادی تھی۔ اس سلطنت اور اس خزانے کا دفاع وہ فقرِ غیور کی تلوار سے کرتے رہے۔ اس سلطنت پر ہر آن سیاسی طاقت کی طرف سے ترغیب و ترہیب کے حملے ہوتے، مگر اس کے کارپردازوں نے ہر قیمت پر اور ہر قربانی دے کر اس کا بچاؤ کیا۔ انہوں نے آزادیٔ علم اور آزادیٔ ضمیر کے تحفظ کی بڑی گراں بہا روایات ملت کو دی ہیں۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حکومت کی تسخیرِ علماء کی پالیسی کو شکست دینے کے لیے علمائے حق نے مناصب سے کنارہ کشی کا رویہ اختیار کیا۔ اس سلسلے میں ضروری ہے کہ واقعاتی

مواد بھی سامنے رکھ دیا جائے۔ آغاز ہم اموی دور سے کرتے ہیں۔

وقت کی ایک نمایاں ترستی جس کو حکومت خطرے کی نگاہ سے دیکھتی تھی، امام ابوحنیفہ تھے۔ یہ مرد حق اموی اور عباسی دونوں دوروں میں حکومت کے شدید دباؤ سے دوچار ہوا۔ یزید بن عمر امیر عراق کی طرف سے حضرت امام کے سامنے عہدہ کی پیش کش کی گئی۔ ان کو بقول بعض میر منشی یا افسر خزانہ کی حیثیت سے اور دوسری روایات کے مطابق قاضی کی حیثیت سے کام کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس پیش کش کو آپ نے ٹھکرا دیا اور پھر کوڑے کھائے مگر مان کر نہیں دیئے۔ آخر عاجز آ کر یزید نے چھوڑ دیا اور مکہ چلے گئے[1]۔ یزیدی دور کے گورنر ابن ہبیرہ نے حکومت کے ایما سے حضرت امام کو مجبور کیا کہ وہ "الطراز" (شاہی توشہ خانہ) کی نگرانی ہی قبول کریں۔ انہوں نے انکار کیا۔ ابن ہبیرہ نے قسم کھالی کہ انہیں خدمت قبول کرنی پڑے گی۔ امام نے جوابی قسم کھالی کہ وہ نہیں کریں گے۔ اس پر ابن ھبیرہ نے حکم دیا کہ انہیں اس قدر کوڑے مارے جائیں کہ ان کا خاتمہ ہو جائے۔ امام نے اس حکم پر کہا تو یہ کہا کہ "انما ھی میتۃ واحدۃ" یعنی یہ موت، تو بس ایک ہی بار آئے گی۔ ۲۰۰ کوڑے اس انداز سے لگائے گئے کہ امام ابویوسف کے الفاظ میں گوشت کے ٹکڑے کٹ کٹ کر گرے[2]۔ ابن ھبیرہ نے حکومت کی آن (PRESTIGE) کو بچانے کے لیے خود ہی یہ کہہ کر راہ نکالی کہ یہ شخص مجھ سے مہلت کیوں نہیں مانگ لیتا تاکہ معاملہ پر پھر غور کرلے۔ بعض لوگوں نے حضرت امام کو سمجھا بجھا کر اس پر آمادہ کر لیا اور انہوں نے مہلت طلب کرلی[3]۔ پھر حکومت کی آن بچانے ہی کے لیے ان سے چاہا گیا کہ وہ باہر سے آنے والے فواکہ کے شمار کی خدمت قبول کریں۔

---

[1] عقود الجمان باب ۲۱ - سیرت ائمہ اربعہ از رئیس احمد جعفری - ص ۵۶ - "چراغ راہ" کا اسلامی قانون نمبر ج ۱ - مقالہ "اسلام کا نظام قضا" از مولانا خلیل حامدی - ص ۲۰۶ -

[2] مناقب موفق، ج ۲، ص ۲۱، ۲۲ - امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی - مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم ص ۱۳۹ - ۱۴۰ - 〃 〃 〃 ص ۱۴۱ -

[3] مناقب موفق - ج ۲، ص ۲۴ -

بعض لوگوں کے مشورے سے امام نے چند روز یہ خدمت انجام دی۔ مگر جاری نہ رکھ سکے اور مکہ چلے گئے[1] اس مردِ عظیم کے درخشاں تاریخی کردار پر ہمیں ابھی آگے چل کر بہت کچھ کہنا ہے۔

بہرحال حضرت امام ابوحنیفہ تو وقت کی ایک مثالی انقلابی شخصیت تھے اور اسی لیے ان کو رام کرنے کے لیے حکومت بے حد کوشاں رہی اور یہ مسلسل نشانۂ عتاب بنتے رہے۔ اور بھی سرگشتگانِ عشق تھے جنہوں نے بے نیازی کی اسی ریت کو اختیار کیا۔ مثلاً امام صاحب کے ایک معتمد علیہ دوست ابن المعتمر تھے۔ ابن ہبیرہ نے ان کو بھی بلا کر قضا کا منصب قبول کرنے پر مجبور کیا۔ تلوار سامنے تنی دیکھ کر مان تو گئے مگر دل اور دماغ نے ساتھ نہ دیا۔ پہلا ہی مقدمہ پیش ہوا تو کارروائی سن کر بیٹھ رہے اور کہنے لگے کہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ آخر انہیں معذور ٹھہرایا گیا اور ایک ہی مقدمے پر جان چھوٹ گئی[2]

میمون بن مہران حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دورِ سعید میں محکمۂ افواج کے ایک افسر کی حیثیت سے کام کر چکے تھے اور جزیرہ میں قاضی بھی رہے تھے۔ پھر محمد بن مروان کے زمانے میں بیت المال کے سپردفتر تھے۔ مگر یہ خدمت اپنی دکان میں بیٹھ کر ہی انجام دیتے تھے۔ یزید بن عبدالملک کے دور میں مستعفی ہو گئے۔ ان کے ضمیر کی آواز سنیے جو درحقیقت استعفا کی محرک ہوئی: "میری انگلیاں کٹ جاتیں تو یہ مجھ کو زیادہ پسند تھا بہ نسبت اس کے کہ میں کسی عہدہ کا انچارج ہوتا"[3]

طاؤس بن کیسان جو صحابۂ اجل سے فیض یافتہ اور حبرِ امت حضرت عبداللہ بن عباس کے شاگردِ خاص تھے، اربابِ حکومت کے متعلق ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ "میں نے اربابِ شرف و دول سے زیادہ کسی کو شر انگیز نہیں دیکھا"۔ ایک مرتبہ حجاج کے بھائی محمد بن یوسف کے ہاں گئے

---

[1] مناقب از کردری، ص ۲۷ - امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی۔ از مولانا مناظر احسن گیلانی۔ ص ۱۴۲

[2] صفوۃ الصفوۃ - ص ۶۳ - " " " " ص ۷۸

[3] طبقات ابن سعد ج ۷، ق ۲، ص ۱۷۸ - تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۹۳، ۹۴ - غلامانِ اسلام از مولانا سعید احمد ایم اے ص ۹۳

تو اس نے خادم کو حکم دے کر ان کے کندھوں پر ایک طیلسان اڑھوا یا جسے انہوں نے کندھے ہلا کر گرا دیا۔ محمد بن یوسف ناراض ہو گیا اور یہ چلے آئے۔ ایک مرتبہ حاکم یمن نے ۵۰۰ دینار بطور ہدیہ بھیجے مگر قبول نہیں کیے محمد بن یوسف ہی نے ایک بار انہیں تحصیلداری پر لگایا۔ انہوں نے تحصیلداری اس طریقے سے کی کہ باقیدار رضا کارانہ طور پر جو زکوٰۃ دیتا لے آتے اور نہ دیتا تو اس سے کچھ نہ کہتے[1]

اسی طرح ایوب بن ابی تمیمہ سختیانی حکام سے نفرت میں یہاں تک پہنچے کہ فرماتے: "مجھ کو میرا بیٹا کہ سب سے زیادہ محبوب ہے مگر اس کے باوجود اسے اپنے ہاتھوں سے دفن کر دینا مجھے زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ ہشام یا کوئی اور خلیفہ میرے پاس آئے[2]"

اب عباسی دور کو لیجیے:

یہاں بھی حضرت امام ابو حنیفہ کا مقام بڑا ممتاز رہا۔ منصور نے بغداد کو مرکز بنانے کے بعد ابراہیم کی انقلابی تحریک کے حامیوں کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی۔ اس نے مکہ سے امام ابو حنیفہ کو بلوا لیا۔ ان کے انقلابی مزاج کو ختم کرنے کے لیے اس نے بجائے دار و رسن کا طریقہ اختیار کرنے کے انہیں عہدہ پر لانے کی کوشش کی۔ اس نے زہر کے بجائے گڑ سے کام لینا چاہا۔ بصرہ، کوفہ اور بغداد کے علاقوں کی قضا کا عہدہ ان کے سامنے رکھا گیا[3] اس معذرت کے ساتھ انکار کیا کہ میں اس کام کا اہل نہیں ہوں۔ پھر اپنے قول کی توضیح کی کہ اگر میں نے سچ کہا تو نا اہل ثابت اور اگر جھوٹ بولا ہے تو جھوٹا آدمی قضا کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا۔ منصور نے قسم کھالی کہ تمہیں عہدہ لازماً قبول کرنا ہو گا۔ جواباً امام صاحب نے بھی قسم کھالی کہ میں قبول نہیں کروں گا۔ برہم ہو کر منصور نے ۳۰ کوڑے لگوا دیے۔ اس وقت امام ۷۰ برس کے بزرگ تھے۔ منصور کو اس کے چچا عبد الصمد نے اس حرکت پر سخت ملامت کی۔ اس پر وہ فی تازیانہ ایک ہزار درہم فدیہ دینے پر آمادہ ہو گیا۔

---

[1] غلامانِ اسلام۔ از مولانا سعید احمد ایم۔ اے۔ ص ۱۲۸، ۱۲۹۔ [2] ایضاً ص ۱۴۶

[3] مناقب کردری۔ ج ۲، ص ۲۱۔ مناقب موفق ج ۲، ص ۱۷۲، ۱۷۳۔ سیرت ائمہ اربعہ از رئیس احمد جعفری ص ۶۱

مگر امام نے یہ بھی قبول نہ کیا۔[1] پھر ان سے یہ چاہا گیا کہ وہ بابِ خلافت پر موجود رہ کر فتویٰ دیا کریں۔ امام اس پر بھی راضی نہ ہوتے۔ قید میں ڈالنے اور سختی کرنے کا حکم ہوا۔[2] اس کے بعد پھر ایک کوشش کی گئی۔ شدید دباؤ کے تحت وہ رصافہ نامی چھوٹی سی آبادی (فوجی کیمپ) کے قاضی بنائے گئے۔ مگر اس کام کو بھی نہ چلا سکے۔ کوشش یہاں تک بھی کی گئی کہ آپ خزبافوں کے عریف کا عہدہ قبول کر لیں[3] کیونکہ اس میدان میں امام کی تجربی مہارت مسلّم تھی۔ مگر یہ بھی قبول نہیں کیا۔ کشمکش کے ان مختلف مراحل سے گزرتے ہوتے بالآخر وہ قید خانہ ہی میں محبوبِ حقیقی سے جا ملے۔ اس دوران میں آپ کے سامنے رقمی عطیہ بھی پیش کیا گیا۔ آپ نے کوڑوں کے زخموں کے لیے یہ سیمیں مرہم بھی قبول نہ کیا۔ اس معاملے میں تو وہ اتنے محتاط تھے کہ حکومت سے ایک درہم تک لینے کے روادار نہ تھے۔[4] آزادیٔ ضمیر کی راہ ادھر ہی سے ہو کے نکلی ہے، جیسے کہ مسعر بن کدام نے کہا تھا کہ: "جس نے سرکہ اور بھاجی پر صبر کیا، اسے غلام نہیں بنایا جا سکتا۔"[5] آزادیٔ ضمیر کے تحفظ ہی کی خاطر امام ابوحنیفہ نے خز کا کاروبار چلایا اور ایسے پیمانہ کبیر پر پہنچایا کہ دینی جدوجہد اور اہلِ حاجات پر اپنی گرہ سے کھلے ہاتھوں مال خرچ کرتے تھے۔

اس لمبے ابتلا سے گزرتے ہوتے مامون نے امام ابوحنیفہ کی تذلیل کے لیے بطورِ سزا ان کو خشت شماری کا کام بھی کچھ عرصہ کے لیے سونپا۔[6] اس سے وہ مقصد تو پورا نہ ہو سکتا تھا جو حکومت کے سامنے تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ اقتدار علم کو جھکا نہ سکا۔

اب دوسرے اربابِ عزیمت کو لیجیے۔

---

[1] مناقب موفق۔ ج ۲، ص ۱۸۱، ۱۸۲۔ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی۔ از مولانا مناظر احسن گیلانی۔ ص ۱۷۲، ۱۷۳، نیز ص ۲۱۲ ۔ [2] مناقب موفق۔ ج ۲، ص ۱۷۳، ۱۷۴

[3] جامع المسانید (روایت ابوبکر بن عیاش) ج ۱، ص ۵۵۔ [4] مناقب موفق۔ ج ۱، ص ۲۱۳

[5] تذکرۃ الحفاظ۔ ج ۱، ص ۱۷۸۔

[6] المامون ۔ از علامہ شبلی نعمانی۔ ص ۱۲۷

حضرت سفیان ثوری کا تذکرہ اوپر ہوا۔ ان پر سفاح ہی کے دور سے حکومت کی توجہ تھی۔ ان کے عدمِ تعاون کے رویے پر سفاح کی طرف سے عتاب ہوا اور پھر بطور ازالہ اشرفیاں دینے کی کوشش کی گئی۔[۱] بعد میں ان کو خلیفہ مہدی کے دربار میں لایا گیا۔ دربار کی طرف سے اصرار ہوا کہ منصبِ قضا قبول کریں۔ فرمان لکھ کر ان کو دے دیا گیا۔ حضرت ثوری دربار سے نکلے، فرمان کو دجلہ کی لہروں میں پھینکا اور غائب ہو گئے۔[۲] پھر یہ گرفتار ہو کر دوبارہ خلیفہ مہدی کے دربار میں پیش ہوئے۔ مہدی نے کہا کہ "تم جو حکومت سے بھاگے پھرتے ہو اس طرح سے بچ نہیں سکتے۔ اب بتاؤ کہ اگر میں کوئی حکم دوں تو تم کیا کرو گے؟" حضرت سفیان ثوری جواب دیتے ہیں کہ: "جو سب سے بڑی قدرت والا ہے وہ تم پر بھی حکم نافذ کرنے کے لیے اقتدار رکھتا ہے۔" مہدی کا درباری امیر ربیع تلوار کی ٹیک لگائے یہ مکالمہ سن رہا تھا۔ حضرت ثوری کا جواب سن کر غصہ سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور مہدی سے وہ کہنے لگا:

"حضور! اس گنوار اور جاہل کی یہ مجال کہ یہ سرِ دربار آپ کے سامنے ایسا گستاخانہ کلام کرتا ہے۔ اجازت دیجیے کہ میں اس کی گردن مار دوں!"

یہ ہے وہ ذلیل انسانی کردار جو مطلق العنان اقتدار کے سایے میں پروان چڑھا کرتا ہے جس کی دلیلِ واحد تلوار ہوتی ہے اور جو بات بات پر مغلوب الغضب ہو جاتا ہے، جس کے رونگٹے عدمِ تحمل کی وجہ سے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جس کے پاس ہر اختلاف کا حل ہی ہوتا ہے کہ "گردن مار دوں" اور جو "حضور حضور" کہہ کر فرماں روا کو خدا بنا دیتا ہے۔ مگر مہدی اپنے درباری کے مقابلے میں یہ فوقیت رکھتا تھا کہ اس کی نظر اپنے جذبات کے ساتھ ساتھ سیاسی مصالح پر بھی تھی۔ کہا: "بدبخت چپ رہ! یہ شخص اور ایسے لوگ یہی تو چاہتے ہیں کہ ہم

[۱] حقیقۃ الفقہ۔ ص ۲۲۱، ۲۲۲

[۲] وفیات ابن خلکان۔ ج ۱: ص ۲۱۰۔ تاریخ اسلام از مولانا عبدالقیوم ندوی ج ۲، ص ۵۴۔ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی۔ از مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم۔ ص ۳۰۔

ان کو قتل کر کے ان کی کامیابی کو اپنی بدبختی اور بدنامی کا ذریعہ بنا لیں[1]۔" غرضکہ وہ شاہین دست آموز شاہ نہ ہو سکا۔

ربیعۃ الرائی بن فروخ جو حدیث و فقہ میں حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام ابو حنیفہ دونوں کے استاذ تھے۔ ان کے کمالِ تفقہ اور شہرۂ علم کے پیش نظر ابوالعباس السفاح نے عہدۂ قضا ان کے سامنے رکھا اور اس مقصد کے لیے کسی بہانے سے ان کو انبار کے مقام پر بلوایا مگر امام ربیعہ نے اس کی پیش کش قبول نہیں کی۔ سفاح سے ان کو تنفر تھا۔ ایک مرتبہ اس نے کوئی تحفہ بھجوایا تو وہ بھی واپس کر دیا پھر اس نے ۵۰ ہزار درہم بھجوائے۔ آپ نے یہ رقم بھی قبول نہیں کی[2]۔

محمد بن سیرین جو حضرت ابوہریرہ، ابن عمر اور عمران بن حصین جیسے ممتاز صحابہ کے فیضِ صحبت سے مشرف تھے اور فارس میں مدت تک حضرت انس بن مالک کے کاتب رہ کر علمی استفادہ کر چکے تھے، فقہ میں اتنا بلند مقام رکھتے تھے کہ ابن سعد، حافظ ذہبی، امام نووی اور حافظ ابن حجر اور خطیب بغدادی نے دل کھول کر اس کا اعتراف کیا ہے۔ عثمان البتی کے الفاظ ہیں" اس نواح میں محمد بن سیرین سے بڑا کوئی ماہر فقہ نہیں ہے"۔ مگر ان کے سامنے جب عہدۂ قضا رکھا گیا تو وہ شام بھاگ گئے اور پھر وہاں سے مدینہ چلے گئے[3]۔

عبداللہ بن وہب (۱۲۵ھ تا ۱۹۷ھ) جنہوں نے حضرت امام مالک کی خدمت میں حصولِ فیض کے ۲۰ سال گزارے، امام ہی کی نگاہ میں فقیہ مصر قرار پائے۔ خلیفۂ وقت نے درخواست کی کہ مصر کے عہدۂ قضا کو قبول کریں۔ اس اطلاع کے ملتے ہی روپوش ہو گئے۔ اتفاقاً ان کے ایک قدر شناس اسد بن سعد نے ان کو ایک بار گھر پر دیکھ لیا اور ان کو ترغیب دلائی کہ لوگوں کے درمیان کیوں نہیں آپ کتاب و سنت کے مطابق حکم کرتے۔ جواب دیا:

---

[1] المسعودی بر کامل ص ۱۱۲ ـ مروج الذہب ج ۶ ص ۲۵۷، ۲۵۰ ـ ابن خلکان ج ... ص ... امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی از مولانا مناظر احسن گیلانی ص ۱۹۰-۱۹۱ ـ تاریخ اسلام از مولانا عبدالقیوم ندوی ـ ج ۲ ص ۵۴ [2] تاریخ خطیب بغدادی ج ۸ ص ۴۲۳ تا ۴۲۵ ـ غلامان اسلام از مولانا سعید احمد اکبر آبادی ـ تذکرہ امام ربیعہ ص ۲۱۵ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۶۹ ـــــ ص ۱۸۸

"کیا تمہاری عقل بس یہیں تک پہنچتی ہے؟ تمہیں معلوم نہیں کہ قیامت میں علماء انبیاء کے ساتھ اٹھائے جائیں گے اور قضاۃ کا حشر سلطان کے ساتھ ہوگا۔"[1]

اسمٰعیل بن علیّہ الہروی مخلصین کی صف میں سے تھے مگر بعض دوسرے علماء کی طرح معاشی مجبوری سے حکومت کی ملازمت کر لی۔ کچھ عرصہ تک بصرہ میں صدقات کا انتظام انہیں سونپا گیا، بعد ازیں بغداد میں فوجداری مقدمات کی عدالت کرنے لگے۔ ابن علیہ کے علم وفضل کی وجہ سے حضرت عبداللہ ابن مبارک ان کی مالی امداد کیا کرتے تھے۔ ان کے زمانۂ قضا میں عبداللہ بن مبارک بغداد میں تشریف لاتے تو یہ ملاقات کے لیے گئے مگر اُدھر سے التفات نہ ہوا۔ انہوں نے واپس جاکر ایک خط لکھا اور گلہ کیا۔ انہوں نے جواب میں ذیل کے اشعار لکھ بھیجے ؎

يا جاعل الدين له بازيًا

ليصطاد اموال المساكين

اے وہ کہ جس نے دین کو باز بنا لیا ہے تاکہ اس کے ذریعے مساکین کے اموال کا شکار کرے!

اين رواياتك في سردها

لترك ابواب السلاطين

وہ تیرا شاہوں کے دروازوں سے بے نیاز ہوکر روایات احادیث میں مشغول ہونا کدھر گیا؟

إنْ قُلْتَ اُكْرِهْتُ فهذا باطلٌ

زَلَّ حمارُ العلم في الطين

اگر تو عذر میں کہے کہ میں قبولِ عہدہ پر مجبور ہو گیا تھا تو یہ غلط ہوگا۔ اب تو علم کا گدھا دلدل میں پھنس گیا!

اشعار پڑھ کر ابن علیہ پر رقت طاری ہو گئی۔ استعفیٰ لے کر ہارون کے پاس پہنچے

[1] ابن خلکان ج ۱، ص ۲۴۹ - غلامانِ اسلام - از مولانا سعید احمد ایم اے، ص ۳۰۹

اور بڑھاپے کا عذر پیش کیا۔ ہارون نے یہ کہتے ہوئے کہ تجھے اس دیوانے (یعنی عبداللہ بن مبارک) نے بہکایا ہوگا، ان کے اصرار کی وجہ سے استعفیٰ منظور کر لیا۔[1]

امام محمد بن شیبانی کو قضا پر لانے کے لیے مجبور کیا گیا۔ انکار کرنے پر قید میں ڈال دیئے گئے۔ آخر تشدد کی وجہ سے قبول کیا تو مجبوراً۔[2] خلیفہ منصور کے والیٔ مصر یزید بن حاتم نے حیوٰۃ کو قاضی بنانا چاہا۔ انہوں نے انکار کیا اور کہا کہ جو چاہو کر لو، یہ نہیں کرونگا۔[3]

زفر جو امام ابوحنیفہ کے شاگرد تھے، ان کو منصبِ قضا قبول کرنے کے لیے کہا گیا۔ یہ روپوش ہو گئے۔ ان کا گھر ڈھا دیا گیا۔ مگر اس کے باوجود وہ آمادہ نہیں ہوئے۔ آخر حکومت نے ان کا پیچھا چھوڑ دیا۔[4]

امام صاحب کے ایک اور شاگرد سہل بن مزاحم کو مامون نے خراسان کی گورنری کے زمانہ میں قضا کا عہدہ قبول کرنے کیلیے مجبور کیا۔ انہوں نے اس سے انکار کیا اور جیل بھیج دیئے گئے۔ تنگ آکر مامون نے انہیں چھوڑ دیا۔[5]

حارث بن مسکین کے سامنے مامون کے وزیر فضل بن مروان نے مصر کی قضا کا منصب پیش کیا۔ حارث نے قبول نہیں کیا۔ پھر متوکل نے بھی ان کو دعوت دی مگر وہ آمادہ نہ ہوئے۔ آخر بربائے مصلحت بعض احباب نے ان کو مجبور کیا تو بادلِ ناخواستہ تیار ہو گئے۔[6]

اسی طرح سعید بن ربیعہ کو، عبید بن رفاعہ نے اور علی بن معبد بن شداد العبدی کو مامون نے مسندِ قضا پر لانا چاہا۔ مگر یہ حضرات اس پر تیار نہیں ہوئے۔[7]

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی۔ ج ۶ ص ۲۳۵، ۲۳۶۔ غلامانِ اسلام از مولانا سعید احمد ایم اے ص ۴۰۸، ۴۰۹

[2] چراغ راہ کا اسلامی قانون نمبر۔ ج ۱ مقالہ "اسلام کا نظامِ قضا" از مولانا خلیل حامدی۔ ص ۲۰۶

[3] حوالہ ایضاً ص ۲۰۷۔ [4] مفتاح السعادہ۔ ج ۲ ص ۱۱۴۔ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی از مولانا مناظر احسن گیلانی ص ۲۵۴۔ [5] امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی از مولانا مناظر احسن گیلانی ص ۱۹۶

[6] چراغ راہ کا اسلامی قانون نمبر ج ۱۔ مقالہ: "اسلام کا نظامِ قضا" از مولانا خلیل حامدی ص ۲۰۷

[7] حوالہ ایضاً ص ۲۰۷۔

حضرت عبداللہ بن مبارک کی ممتاز شخصیت کو لیجیے جن کی وفات پر خلیفہ ہارون نے یہ کہا تھا کہ "افسوس اعلماء کے سردار کا انتقال ہو گیا" خلیفہ ہارون ان سے ملاقات کا تمنائی تھا۔ مگر خود یہ امام غیور اس پر آمادہ نہ تھے۔ ایک بار ہارون سے ملنے جا پہنچے۔ ایک حیرت زدہ کے استفسار پر آپ نے فرمایا کہ میں اپنے دل کو موت پر راضی کرنا چاہتا تھا مگر وہ نہیں ہوتا تھا۔ اب جبکہ وہ اس پر رضامند ہو گیا تو میں ہارون کے پاس چلا آیا" فرماں رواسے ملاقات تک کے لیے جس عالم کا یہ نقطۂ نظر ہو اسے قبول عہدہ کی دعوت دینے کی جرأت کون کرتا۔ ان کا حال تو یہ تھا کہ ملازمت پسند عالموں کے کردار کی تصویر اشعار میں یوں کھینچتے کہ ؎

صیرت دینك شاهيناً تصيد به

لیس یفلح اصحاب الشواهین

تو نے اپنے دین کو ایک شاہین بنالیا ہے تاکہ اس کے ذریعے شکار کرتا پھرے

حالانکہ یہ شاہینوں والے شکاری کبھی فلاح نہیں پاسکتے۔

اوپر بھی اسی مضمون میں ان کے تین اشعار درج ہو چکے ہیں۔ پھر وہ علم دین کے طلبہ کو مالی سہارا اسی نقطۂ نظر سے بہم پہنچاتے تھے کہ یہ طلب دنیا کے چکر میں نہ پڑیں اور معاشی مجبوری کی وجہ سے حکمرانوں کے ہاتھ نہ بک جائیں۔ اس رویے کی وجہ ہی سے ہارون کی نگاہ میں وہ مرد مجنون ٹھہرے [۱]

خلیفہ مطیع نے ابوالحسن محمد بن شیبان کو قضا کا عہدہ پیش کیا۔ پہلے تو انہوں نے انکار کیا، پھر اس شرط پر قبول کرنے پر راضی ہوئے کہ عدالت کو تاج خلافت کی طرف سے آلۂ کار نہ بنایا جائے گا، معزول نہ کیا جائے گا اور شریعت کے خلاف کسی امر کے لیے سفارش نہ کی جائیگی خلیفہ نے اقرار نامہ لکھ دیا اور تقرری ہو گئی۔ محمد بن شیبان تمام قلمروِ عباسی کے قاضی القضاۃ تھے [۲]

۱؎ غلامانِ اسلام۔ از مولانا سعید احمد ایم۔ اے۔ تذکرہ عبداللہ بن مبارک۔ از ص ۱۳۱

۲؎ تاریخ الخلفاء ص ۲۶۷۔ اسلام کا نظامِ مملکت از پروفیسر حسن ابراہیم حسن۔ ص ۳۱۹، ۳۲۰۔

باضمیر علماء میں سے بعض نے انتہائی معاشی اضطرار کے عالم میں منصب قبول کیا اور احساس کراہت کا کانٹا ان کے دل میں ہمیشہ کھٹکتا رہا۔ حکومت جو پورے معاشرے کی عناں بردار ہوتی ہے جب کسی خاص عنصر کے "پیچھے" پڑ جاتی ہے تو اس پر نہ صرف یہ کہ کسی مقصد کے لیے کام کرنے کے راستے بند کرتی جاتی ہے بلکہ قوتِ لایموت کا حصول بھی اس کے لیے ناممکن بنا دیتی ہے۔ اس میں سے کچھ لوگ اضطرار میں مبتلا ہو کر خدمات قبول کرتے ہیں اور جو اپنی جگہ ثابت قدم رہتے ہیں۔ ان کا دائرۂ کار اور ان کی قوتِ کار بہت کم ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی ابتلا علمائے حق کو درپیش تھا۔ مثلاً قاضی حفص بن غیاث کا بیان ہے کہ: "جب حالات نے مردار کھانا میرے لیے حلال کر دیا تب میں نے قضا کا عہدہ قبول کیا"[1] اسی طرح قاضی ابو یوسف اگرچہ نظام قائم کے اندر سے اصلاح و تعمیر کا ایک منصوبہ ذہن میں لے کر قضا پر گئے تھے تاہم یہ اقدام بھی انہوں نے اس وقت کیا جبکہ ان کے معاشی حالات انتہائی سنگین ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ سسرالی گھر کے شہتیر فروخت کر کے بسر اوقات ہو رہی تھی[2]۔

اس مقاومت سے جہاں آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ علم کا تحفظ مقصود تھا وہاں اس کا فائدہ یہ بھی تھا کہ اگر علمائے حق مناصب پر جائیں تو ایک وزن اور وقار کے ساتھ جائیں اور کام کرنے کے لیے اچھی شرائط کے تحت موزوں حالات پیدا کرا سکیں۔ عملاً ایسا ہی ہوا بھی۔ علمائے حق میں سے جو اصحاب بھی مناصب پر آتے وہ کبھی اپنے عہدے اور تنخواہ کے غلام نہیں بنے۔ بلکہ غلامی انہوں نے کی تو صرف خدائے واحد کی کی۔ استعفے ان کی جیب میں رکھے رہتے تھے اور جان ہتھیلیوں پر رہتی اور انصاف کے اسلامی اصولوں، عدلیہ کی آزادی اور ججوں کے وقار کو قائم کرنے کے لیے وہ مطلق العنان اقتدار کے مقابلے پر اس مضبوطی سے کھڑے ہو جاتے کہ ان کی مثالوں سے آج بھی ہم ایک روح خودی حاصل کرتے ہیں۔ (باقی)

---

[1] امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی۔ از مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم۔ ص ۲۵۷ (حاشیہ) [2] ایضاً۔

ابوالاعلیٰ مودودی

ایک اسلامی یونیورسٹی کا نقشہ

مختلف مسلم ممالک میں اس طرح کی تجویزیں کی جا رہی ہیں کہ مسلمانوں کے نظامِ تعلیم میں بنیادی تغیرات کیے جائیں اور ایک ایسے جدید طرز پر اسلامی تعلیم کے ادارے قائم کیے جائیں جو مسلم نوجوانوں کو اسلام کے نصب العین کے مطابق دنیا کی رہنمائی کے لیے تیار کر سکیں۔ لیکن اس سلسلے میں اب تک جتنے ادارے قائم ہوئے ہیں ان کے نقشے اور کام کو دیکھ کر عالم اسلامی کے اصحابِ فکر میں سے غالباً کوئی بھی پوری طرح مطمئن نہیں ہے۔ اس وقت درحقیقت عالم اسلامی کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ نہ تو ایک دارالعلوم یا کلیۃ شرعیہ ہے جو قدیم طرز کے علماء تیار کرے، اور نہ ایک جدید یونیورسٹی جو مغربی علوم کے ماہرین پیدا کرے، بلکہ وہ ایک ایسی جامعہ ہے جو دنیا میں اسلام کے علمبردار تیار کر سکے۔

انڈونیشیا سے لیکر مراکش تک تمام مسلمان ملکوں میں اس وقت دو طرح کے نظامِ تعلیم رائج ہیں۔ ایک نظامِ تعلیم خالص مغربی ذہن و فکر رکھنے والے اور مغربی تہذیب و تمدن کے رنگ میں رنگے ہوئے آدمی تیار کر رہا ہے اور اسی کے تیار کیے ہوئے لوگ مسلم ممالک کی حکومتوں کے نظام چلا رہے ہیں۔ انہی کے ہاتھ میں معیشت کا سارا کاروبار ہے، وہی سیاست کی باگیں تھامے ہوئے ہیں اور وہی تمدن و تہذیب کی صورت گری کر رہے ہیں۔ لیکن یہ لوگ بالعموم دین کے علم و فہم سے عاری اور مغربیت سے مرعوب و مغلوب ہیں، اس لیے یہ دنیا بھر میں امتِ مسلمہ کی گاڑی کو روز بروز نہایت تیزی کے ساتھ اسلام کی مخالف سمت میں لیے جا رہے ہیں۔ دوسرا نظامِ تعلیم علومِ دینی کے علماء تیار کر رہا ہے جو دنیوی علوم سے بالعموم ناواقف ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے محض مذہبی شعبۂ حیات کی محافظت کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ یہ لوگ

دنیا میں کہیں بھی اُن قابلیتوں اور ان اوصاف سے متصف نہیں ہیں جن سے یہ زندگی کی گاڑی کے ڈرائیور بن سکیں۔ ہر جگہ یہ صرف ایک بریک کا کام دے رہے ہیں جس کا کام اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ مقدم الذکر گروہ جس تیزی کے ساتھ امت کی گاڑی کو مخالف سمت میں لے جانا چاہتا ہے اس میں رکاوٹ پیدا کرے اور رفتار کو سست کرتا رہے۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہر مسلمان ملک میں یہ بریک روز بروز کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے، بلکہ بعض ملکوں میں تو بدمست ڈرائیور اس بریک کو توڑ چکے ہیں اور الحاد و فجور کے راستہ پر بے تحاشا اپنی قوم کو دوڑائے لیے جا رہے ہیں۔ قبل اس کے کہ باقی مسلمان ملکوں میں وہ وقت آئے جبکہ ہر جگہ یہ بریک ٹوٹ چکا ہو، ہمیں ایک ایسا نظامِ تعلیم قائم کرنے کی فکر کرنی چاہیے جس سے بیک وقت دین و دنیا کے عالم تیار ہوں، جس سے نکلنے والے بریک کی جگہ نہیں، بلکہ امت کی گاڑی کے ڈرائیور کی جگہ سنبھالنے کے قابل ہوں، اور اپنے اخلاق و کردار کے اعتبار سے بھی اور ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی مغربی طرز کے نظامِ تعلیم سے فارغ ہونے والوں کی بہ نسبت فائق تر ہوں۔

اس ضرورت کو مسلم دنیا کا کوئی تعلیمی ادارہ پورا نہیں کر رہا ہے۔ عالمِ اسلامی کے تمام اہلِ فکر پریشان ہیں کہ اگر ایسا ایک نظامِ تعلیم قائم نہ ہوا تو امتِ مسلمہ کو دین و اخلاق کی مکمل تباہی سے کیسے بچایا جا سکے گا۔ اس طرح کا نظامِ تعلیم بنانے کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہے وہ صرف حکومتیں ہی فراہم کر سکتی ہیں۔ اور مسلم ممالک کی حکومتیں جیسے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں ان کا حال کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس حالت میں میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ میرے ذہن میں اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایک تعلیمی ادارے کا جو خاکہ ہے اسے عالمِ اسلامی کے سامنے پیش کر دوں۔ شاید کہ اہلِ علم و فکر اسے پسند کریں اور دنیا کی کوئی مسلم حکومت اس کو جامہ پہنانے کے لیے تیار ہو جائے، یا اللہ کچھ اہلِ ثروت و اہلِ خیر اصحاب کا سینہ اس کام کے لیے کھول دے۔

اس یونیورسٹی کے لیے میں اپنی تجاویز نہایت اختصار کے ساتھ سطور ذیل میں پیش کرتا ہوں:

۱۔ سب سے پہلی ضروری چیز یہ ہے کہ اس یونیورسٹی کا مقصد واضح طور پر معین کر دیا جائے تاکہ اس کا سارا انتظام اسی کے لحاظ سے وضع کیا جائے، اس میں کام کرنے والے بھی اسی کو نگاہ میں رکھ کر کام کریں، اور اسے دیکھنے والے بھی اس معیار پر جانچ کر اسے دیکھ سکیں کہ وہ اپنے مقصد کو کہاں تک پورا کر رہی ہے۔ میرے نزدیک اس کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ

"وہ ایسے صالح علماء تیار کرے جو اس دورِ جدید میں ٹھیک ٹھیک دینِ حق کے مطابق دنیا کی رہنمائی کرنے کے لائق ہوں"

۲۔ اس کو اپنا دائرہ کار صرف علومِ اسلامیہ تک محدود رکھنا چاہیے۔ دوسرے علوم اس میں اس حیثیت سے پڑھائے جائیں کہ وہ علومِ اسلامیہ کے لیے مددگار ہوں نہ اس حیثیت سے کہ اس یونیورسٹی کو اُن علوم کے ماہرین تیار کرنے ہیں۔

۳۔ اسے لازماً ایک اقامتی یونیورسٹی ہونا چاہیے جس میں طالب علم ہمہ وقت رہیں اور اساتذہ بھی یونیورسٹی کے حدود میں سکونت پذیر ہوں۔

۴۔ اسے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے کھلا ہونا چاہیے تاکہ ہر جگہ کے طالب علم آزادی کے ساتھ اس میں آکر داخل ہو سکیں۔

۵۔ اس کا پورا ماحول ایسا ہونا چاہیے جو طلبہ میں تقویٰ اور اخلاقِ فاضلہ پیدا کرنے والا اور ان کے اندر اسلامی ثقافت کو مستحکم کرنے والا ہو۔ اس کو مغربی ثقافت کے اثرات سے محفوظ رکھا جانا چاہیے تاکہ اس کے طلبہ میں وہ شکست خوردہ ذہنیت پیدا نہ ہونے پائے جو مغرب سے مغلوب اور مرعوب ہونے والی قوموں میں ہر جگہ پیدا ہو رہی ہے۔ اس کے حدود میں مغربی لباس کا استعمال ممنوع ہونا چاہیے۔ اس میں طلبہ کے کھیل اور تفریحات کے لیے بھی مغربی کھیلوں کے بجائے گھوڑے کی سواری، تیراکی، نشانہ بازی، اسلحہ کا استعمال، موٹر سائیکل اور موٹر چلانے کی مشق، اور ایسی ہی دوسری تفریحات رائج کی جانی چاہییں۔ اس کے ساتھ انہیں کسی حد تک فوجی تربیت بھی دی جانی چاہیے۔

۶۔ اس کے لیے اساتذہ کا انتخاب بھی صرف علمی قابلیت کی بنا پر ہی نہ ہونا چاہیے بلکہ اس کے تمام اساتذہ اپنے عقائد و نظریات اور اپنی عملی زندگی کے لحاظ سے صالح اور متقی ہونے چاہییں۔ اس جامعہ کے لیے گہری چھان بین کے بعد ایسے اساتذہ کو عالم اسلامی کے مختلف ممالک سے منتخب کیا جائے جو اعلیٰ درجہ کی علمی قابلیت رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے عقائد و افکار کے لحاظ سے پورے مسلمان ہوں، عملاً احکام اسلامی کا اتباع کرنے والے ہوں، اور مغربی ثقافت سے شکست خوردہ نہ ہوں۔ بلکہ میں تو یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جامعہ کے لیے جن اساتذہ کو منتخب کیا جائے ان کے متعلق یہ اطمینان بھی کر لیا جائے کہ ان کے گھر والے بھی حدودِ شرعیہ کی پابندی سے آزاد نہ ہوں اس لیے کہ جامعہ کے حدود میں اگر طلبہ کے ساتھ ایسے اساتذہ رہیں جن کے گھر کی خواتین تبرّجِ جاہلیت میں مبتلا ہوں اور جن کے گھر سے نغموں کی آوازیں بلند ہوتی رہیں تو طلبہ کو ان سے کوئی اچھا سبق نہ مل سکے گا۔

۷۔ اس کے طلبہ کو ایسی تربیت دی جانی چاہیے کہ ان میں خصوصیت کے ساتھ حسبِ ذیل اوصاف پیدا ہوں:

(الف) اسلام اور اس کی تہذیب پر فخر اور اسے دنیا میں غالب کرنے کا عزم،

(ب) اسلامی اخلاق سے اِتصاف اور اسلامی احکام کی پابندی،

(ج) دین میں تفقہ اور مجتہدانہ بصیرت،

(د) تنگ نظرانہ فرقہ بندی سے پاک ہونا،

(ھ) تحریر و تقریر اور بحث کی عمدہ صلاحیتیں اور تبلیغِ دین کے لیے مناسب قابلیتیں

(و) جفاکشی، محنت، چُستی، اور اپنے ہاتھ سے ہر طرح کے کام کر لینے کی صلاحیت

(ز) تنظیم و انتظام اور قیادت کی صلاحیتیں۔

۸۔ اس میں صرف وہ لوگ داخل کیے جانے چاہییں جو ثانوی تعلیم کے مرحلے سے

فارغ ہو چکے ہوں۔ عرب ممالک سے آنے والے طلبہ براہِ راست اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔ لیکن غیر عرب ممالک کے طلبہ اگر عربی زبان میں کافی استعداد نہ رکھتے ہوں تو ان کے لیے کم از کم ایک سال کا کورس الگ ہونا چاہیے تاکہ انہیں عربی زبان کی کتابوں سے استفادہ کے قابل بنایا جا سکے۔

۹۔ اس کی تعلیم کو ۹ سال کے تین مرحلوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ مرحلۂ اولیٰ ۴ سال۔ مرحلۂ ثانیہ تین سال۔ اور مرحلۂ ثالثہ دو سال۔

۱۰۔ مرحلۂ اولیٰ میں حسبِ ذیل مضامین کی تعلیم ہونی چاہیے اور ان کو تعلیم کی چار سالہ مدت پر مناسب طریقے سے تقسیم کر دینا چاہیے:۔

(الف) عقائدِ اسلام، اس تفصیل کے ساتھ کہ قرآن و سنت کی رو سے اسلام کے عقائد کیا ہیں، اور ان کے حق میں کیا نقلی اور کیا عقلی دلائل ہیں۔ اس سلسلے میں اختصار کے ساتھ یہ بھی بتایا جائے کہ مسلمانوں میں اختلافِ عقائد کیسے اور کس ترتیب سے رونما ہوا ہے اور اس لحاظ سے دنیائے اسلام میں اس وقت کتنے مذاہب پائے جاتے ہیں۔ اس درس کو بیانِ علمی کے حدود سے متجاوز نہ ہونا چاہیے اور حربِ عقائد سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہیے۔

(ب) اسلامی نظامِ حیات۔ اس مضمون میں طلبہ کو پورے اسلامی نظام سے روشناس کرا دیا جائے۔ اسلام کی بنیاد کن اساسی تصورات پر قائم ہے، ان تصورات کی بنا پر وہ اخلاق اور سیرت کی تشکیل کس طرح کرتا ہے، پھر گھر اور خاندان سے لے کر معیشت سیاست اور بین الاقوامی تعلقات تک مسلم سوسائٹی کی زندگی کے مختلف شعبوں کو وہ کن اصولوں پر منظم کرتا ہے، اور اس سے پوری اسلامی تہذیب کی کیا شکل بنتی ہے۔

(ج) قرآن۔ چار سال کی مدت میں پورا قرآن مختصر تفسیر کے ساتھ پڑھا دیا جائے۔ اس کے لیے تفسیر کی کوئی خاص کتاب مقرر کرنے کے بجائے استاد کو خود کتب تفاسیر سے

استفادہ کرتے ہوئے اس طرح قرآن کا درس دینا چاہیے کہ طلبہ کتابِ الٰہی کا مقصود و مدعا اچھی طرح سمجھ لیں اور جو شکوک و شبہات ان کے ذہن میں پیدا ہوں وہ رفع کر دیئے جائیں۔

(د) حدیث۔ اس مضمون میں اجمالاً تاریخ علمِ حدیث، اور اصولِ حدیث، اور دلائلِ حجیتِ حدیث سے طلبہ کو ضروری حد تک آگاہ کرنے کے بعد، سنن کے مجموعوں میں سے کوئی ایک کتاب مکمل پڑھا دی جائے، مثلاً منتقی الاخبار، یا بلوغ المرام، یا مشکوٰۃ المصابیح۔

(ھ) فقہ۔ اس مضمون میں تاریخ فقہ اور اصولِ فقہ پر ایک ایک مختصر کتاب پڑھانے کے بعد طلبہ کو فقہ کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ وہ مسائلِ فقہیہ میں مختلف فقہا کے مذاہب سے بھی واقف ہوتے جائیں، اور ان کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ماخذِ شریعت سے ائمہ مجتہدین نے کس طرح مسائل کا استنباط کیا ہے۔

(و) تاریخ اسلام۔ اس کا آغاز تاریخ انبیاء علیہم السلام سے کیا جائے، اور پھر خصوصیت کے ساتھ سیرت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور خلفائے راشدین کے دور کو زیادہ تفصیل کے ساتھ پڑھانے کے بعد، مختصراً پوری اسلامی تاریخ سے طلبہ کو روشناس کرا دیا جائے۔

(ز) علوم عمران (SOCIAL SCIENCES). خصوصاً معاشیات، سیاسیات اور سوشیالوجی۔ ان مضامین کی تعلیم کے لیے ایسے اساتذہ کا انتخاب کیا جائے جو اسلامی نقطۂ نظر سے تنقید کے ساتھ تعلیم دے سکیں، مغربی افکار و نظریات جوں کے توں طلبہ کے ذہن میں نہ اتار دیں۔

(ح) ادیانِ عالم، خصوصاً یہودیت، عیسائیت، بودھ مذہب، اور ہندو مذہب سے اجمالی واقفیت۔

(ط) جدید مغربی افکار کی مختصر تاریخ اور ان کے مذاہب، خصوصاً مغربی جمہوریت، اشتراکیت اور فسطائیت وغیرہ

(ی) انگریزی، جرمن، اور فرنچ میں سے کوئی ایک زبان۔

۱۰۔ مرحلۂ ثانیہ میں پانچ فیکلٹیاں ہونی چاہییں۔ تفسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ علم الکلام اور تاریخ۔

۱۱۔ تفسیر کی فیکلٹی میں حسبِ ذیل مضامین ہونے چاہییں:

(۱) تاریخ القرآن،

(۲) تاریخ علم تفسیر، اور مفسرین کے مختلف مذاہب اور ان کی خصوصیات،

(۳) اختلاف قرآت،

(۴) اصولِ تفسیر،

(۵) قرآن مجید کا تفصیلی اور گہرا مطالعہ،

(۶) مخالفین کی طرف سے قرآن پر آج تک جتنے اعتراضات کیے گئے ہیں ان کا جائزہ اور ان کے جوابات،

(۷) احکام القرآن۔

۱۲۔ حدیث کی فیکلٹی میں:

(۱) تاریخ تدوینِ حدیث،

(۲) علومِ حدیث اپنے تمام شعبوں کے ساتھ،

(۳) حدیث کی امہاتِ کتب میں سے کوئی ایک کتاب تفصیلی تنقید کے ساتھ، تاکہ طلبہ کو محدثانہ طریقے پر احادیث کے پرکھنے کی اچھی طرح مشق ہو جائے،

(۴) کتبِ صحاح پر ایک جامع نظر،

(۵) حدیث پر مخالفین کی طرف سے اب تک جتنے اعتراضات کیے گئے ہیں ان کا تفصیلی جائزہ اور اس کے جوابات۔

۱۳۔ فقہ کی فیکلٹی میں:

(۱) اصولِ فقہ،

(۲) تاریخ فقہ،

(۳) فلسفۂ قانونِ جدید،

(۴) رومی و ایرانی قوانین، یہودی شریعت، جدید وضعی قوانین اور اسلامی قوانین کا تقابلی مطالعہ،

(۵) فقہائے اسلام کے مختلف مذاہب اور ان کے اصول،

(۶) قرآن و سنت سے براہ راست استنباط مسائل کی مشق،

(۷) اہلِ سنّت کے چاروں مذاہب کی فقہ۔ اور اس کے ساتھ فقہ ظاہری، فقہ زیدی اور فقہ جعفری بھی۔

۱۴۔ علم الکلام کی فیکلٹی میں:

(۱) مبادی منطق،

(۲) فلسفۂ قدیم و جدید،

(۳) مسلمانوں میں علم کلام کے آغاز سے اب تک کی تاریخ اور ان مذاہب کی تفصیل جو اندرونی اور بیرونی اثرات سے مسلمانوں کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔

(۴) علم الکلام کے مسائل اور ان میں قرآن و سنت کی رہنمائی،

(۵) اسلام پر مخالفین کے اعتراضات کا تفصیلی جائزہ اور اس کے جوابات،

(۶) تقابلِ ادیان۔ خصوصاً مسیحیت کی تاریخ، اور اس کے فرقوں، اور اس کے علمِ کلام کا تفصیلی مطالعہ،

(۷) مسیحی مشنریوں کا کام اور ان کے طریقے۔

۱۵۔ تاریخِ اسلام کی فیکلٹی:

(۱) فلسفۂ تاریخ، مقصد مطالعۂ تاریخ اور طرز مطالعۂ تاریخ قرآن مجید کی رو سے،

(۲) فلسفۂ تاریخ کے مختلف مذاہب ابن خلدون سے اب تک،

(۳) تاریخ عرب و شرق اوسط قبل اسلام،

(۴) تاریخ اسلام عہدِ نبوی سے اب تک بلحاظ فکر، اخلاق، علوم، تمدن و سیاست؛۔
(۵) تجدید و احیائے دین کی تحریکات؛۔
(۶) مسلمان ممالک پر مغربی استعمار کے غلبہ کی تاریخ اور اس کے اثرات و نتائج۔

۱۶۔ مرحلۂ ثالثہ میں داخل ہونے والا طالب علم مذکورۂ بالا فیکلٹیوں میں سے کسی ایک میں کسی خاص موضوع پر دو سال تک علمی تحقیق کرنے کے بعد کوئی مقالہ پیش کریگا جس کو اہلِ علم جانچنے کے بعد اسے سندِ فضیلت دیں گے۔

۱۷۔ اس جامعہ کے لیے ایک اعلیٰ درجہ کی لائبریری ہونی چاہیے جس میں جامعہ کی مذکورۂ بالا ضروریات کے مطابق وسیع پیمانے پر کتابیں فراہم کی جائیں۔

۱۸۔ ایک کمیٹی کا تقرر اس غرض کے لیے کیا جائے کہ جامعہ کی تعلیم کے مختلف مراحل اور شعبوں کے لیے مناسب کتابوں کا انتخاب کرے۔

۱۹۔ ایک اکاڈمی کا قیام اس غرض کے لیے کہ جامعہ کی ضروریات کے لیے مناسب ترین کتابیں تیار کرے۔

رسائل و مسائل

اسلامی حکومت میں متعصب مستشرقین کے افکار کی اشاعت

سوال: کیا اسلامی ملک میں اُن مغربی مستشرقین غیر مسلم اسکالرز اور پروفیسروں کو تعلیم یا تقریر کے لیے مدعو کیا جا سکتا ہے جنہوں نے اپنے نقطۂ نظر سے اسلام کے موضوعات پر کتابیں لکھتے ہوئے نہ صرف اسلام پر بے جا تنقیدی تبصرے کیے ہیں بلکہ عمداً یا کم علمی و تعصب سے اسلامی تاریخ لکھنے میں حضور اکرمؐ، اہلِ بیت، خلفائے راشدین، صحابۂ کرام و ائمۂ کرام (جن پر اسلام اور مسلمانوں کو فخر ہے) کی شان میں نازیبا فقرات لکھ کر ہدفِ ملامت بنایا ہے؟ مثلاً امریکی و برطانوی قابل ترین پروفیسروں کی نظر ثانی شدہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں بھی دیگر اعتراضات کے علاوہ رسول مقبولؐ کی ازواجِ مطہرات کو CONCUBINES (لونڈیاں) لکھا ہے۔ ان میں سے اکثر کے یہاں آکر لکچر اور خطبات دینے اور ان کی تشہیر کرنے پر کیا اسلامی حکومت بالکل پابندی عائد نہ کر دیگی؟ یا ان کتابوں اور زہر آلودہ لٹریچر کی ہماری لائبریریوں میں موجودگی گوارا کی جا سکتی ہے؟ حکومت ان کے جوابات و تردید شائع کرنے ان کی تصحیح کرانے یا ان سے رجوع کرانے کے لیے کیا اقدام کر سکتی ہے؟

جواب: یہ زمانے کے انقلابات ہیں۔ ایک وقت وہ تھا کہ یورپ کے عیسائی اندلس (SPAIN) جا کر مسلمانوں سے انجیل کا سبق لیا کرتے تھے۔ اب معاملہ اُلٹا ہو گیا ہے کہ مسلمان یورپ والوں سے پوچھتے ہیں کہ اسلام کیا ہے اور اسلام کی تاریخ اور اس کی تہذیب کیا ہے۔ حتیٰ کہ عربی زبان بھی مغربی مستشرقین سے سیکھی جاتی ہے، مغربی ممالک سے استاد درآمد کر کے ان سے

اسلامی تاریخ پڑھوائی جاتی ہے، اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو کچھ وہ لکھتے ہیں نہ صرف اسے پڑھا جاتا ہے بلکہ اس پر ایمان بھی لایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ لوگ خود اپنے مذہب اور اس کی تاریخ کے متعلق اپنے ہم مذہبوں کے سوا کسی کی رائے کو ذرہ برابر بھی دخل دینے کی اجازت نہیں دیتے۔ یہودیوں نے اپنی انسائیکلوپیڈیا (JEWISH ENCYLCOPAEDIA) شائع کی ہے اور اس میں کوئی ایک مضمون (ARTICLE) بھی کسی مسلمان تو درکنار کسی عیسائی مصنف کا بھی نہیں ہے۔ بائبل کا ترجمہ بھی یہودیوں نے اپنا کیا ہے۔ عیسائیوں کے ترجمے کو وہ ہاتھ نہیں لگاتے۔ اس کے برعکس یہودی مصنفین اسلام کے متعلق مضامین اور کتابیں لکھتے ہیں اور مسلمان ہاتھوں ہاتھ ان کو لیتے ہیں اور ان کا یہ حق مانتے ہیں کہ ہمارے مذہب اور ہماری فقہ اور ہماری تہذیب اور ہمارے بزرگوں کی تاریخ کے متعلق وہ محققانہ کلام فرمائیں اور ہم یہ چیزیں ان سے سیکھیں۔ یہ صورت حال کسی صحیح اسلامی حکومت میں نہیں رہ سکتی اور نہ رہنی چاہیے اور کوئی وجہ نہیں کہ رہ سکے۔ اسلامی حکومت بھی ہو اور اسلام اور مسلمان یتیم بھی ہوں، یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہیں۔ یہ رویہ مسلمانوں کی غیر اسلامی حکومت ہی کو مبارک رہے۔

غیر مسلم ممالک سے اقتصادی اور صنعتی قرضے

سوال۔ کیا اسلامی حکومت موجودہ دور میں جبکہ ایک ملک دوسرے ملک سے قطع تعلق کر کے ترقی نہیں کر سکتا، غیر ممالک سے مطلق اقتصادی، فوجی، ٹیکنیکل امداد یا بین الاقوامی بینک سے شرح سود پر قرض لینا بالکل حرام قرار دیگی؟ پھر مادی، صنعتی زراعتی و سائنسی ترقی وغیرہ کی جو عظیم خلیج مغربی ترقی یافتہ (ADVANCED) ممالک اور مشرق وسطیٰ بالخصوص اسلامی ممالک یا اس ایٹمی دور میں HAVE اور HAVE NOT کے درمیان حائل ہے کس طرح پر ہو سکے گی؟ نیز کیا اندرون ملک تمام بینکنگ نے

انشورنس سسٹم ترک کرنے کا حکم دیا جانے لگا ؟ سود، پگڑی، منافع و رنج اور گڈول (یا GOODWILL) اور خرید و فروخت میں دلالی و کمیشن کے لیے کونسی اجتہادی راہ نکالی جاسکتی ہے ؟ کیا اسلامی ممالک آپس میں سود، منافع، رنج وغیرہ پر کسی صورت میں قرض لین دین کر سکتے ہیں ؟

جواب :- اسلامی حکومت نے کسی دور میں بھی غیر مسلم ممالک سے قطع تعلق کی پالیسی اختیار نہیں کی اور نہ آج کرے گی لیکن تعلق کے معنی قرض مانگتے پھرنے کے نہیں ہیں، اور وہ بھی اُن کی شرائط پر۔ یہ تعلق اِس زمانے کے کم ہمت لوگوں نے ہی پیدا کیا ہے۔ اگر کسی ملک میں ایک صحیح اسلامی حکومت قائم ہو تو وہ مادی ترقی سے پہلے اپنی قوم کی اخلاقی حالت سدھارنے کی کوشش کرے گی۔ اخلاقی حالت سدھرنے کے معنی یہ ہیں کہ قوم کے حکمران اور اس کی انتظامی مشینری کے کارپرداز اور قوم کے افراد ایماندار ہوں۔ اپنے حقوق سے پہلے اپنے فرائض کو ملحوظ رکھنے اور سمجھنے والے ہوں۔ اور سب کے سامنے ایک بلند نصب العین ہو جس کے لیے جان و مال اور وقت اور محنتیں اور قابلیتیں سب کچھ قربان کرنے کے لیے وہ تیار ہوں۔ نیز یہ کہ حکمرانوں کو قوم پر اور قوم کو حکمرانوں پر پورا اعتماد ہو اور قوم ایمانداری کے ساتھ یہ سمجھے کہ اس کے سربراہ درحقیقت اس کی فلاح کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال اگر پیدا ہو جاتے تو ایک قوم کو باہر سے سود پر قرض مانگنے کی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔ ملک کے اندر جو ٹیکس لگائے جائیں گے وہ سو فیصدی وصول ہوں گے اور سو فیصدی ہی وہ قوم کی ترقی پر صرف ہوں گے۔ نہ ان کی وصولیابی میں بے ایمانی ہوگی اور نہ ان کے خرچ میں ہی بے ایمانی ہوگی۔ اس پر بھی اگر قرض کی ضرورت پیش آئے تو قوم خود سرمایہ کا ایک بڑا حصہ رضاکارانہ چندے کی صورت میں اور ایک اچھا خاصہ حصہ غیر سودی قرض کی صورت میں اور ایک حصہ منافع میں شرکت کے اصول پر فراہم کرنے کو تیار ہو جائے گی۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ پاکستان میں اگر اسلامی اصولوں کا تجربہ کیا جاتے تو شاید بہت جلدی پاکستان

دوسروں سے قرض لینے کے بجائے دوسروں کو قرضہ دینے کے لیے تیار ہو جائے۔

بالفرض اگر ہمیں بیرونی قوموں سے سود پر قرض لینے کی کوئی ناگزیر صورت پیش آہی جائے، یعنی ہمیں اپنی ضرورت کو پورا کرنا بھی لازم ہو اور اس کے لیے ملک میں سرمایہ بھی نہ مل سکے، تو دوسروں سے سود پر قرض لیا جاسکتا ہے۔ لیکن ملک کے اندر سودی لین دین جاری رکھنے کا پھر بھی کوئی جواز نہیں۔ ملک میں سود بند کیا جاسکتا ہے اور پورا مالی نظام (FINANCIAL SYSTEM) سود کے بغیر چلایا جاسکتا ہے۔ میں اپنی کتاب "سود" میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ بینکنگ کا نظام سود کے بجائے منافع میں شرکت (PROFIT SHARING) کے اصول پر چلایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح انشورنس کے نظام میں ایسی ترمیمات کی جاسکتی ہیں جن سے انشورنس کے سارے فوائد غیر اسلامی طریقے اختیار کیے بغیر حاصل ہو سکیں۔ دلالی منافع، پگڑی، کمیشن یا گڈ وِل (GOOD WILL) وغیرہ کی علیحدہ علیحدہ شرعی پوزیشن ہے۔ جب اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آئیگا تو اس کا جائزہ لے کر یا تو سابق پوزیشن بحال رکھی جائے گی یا پھر ضروری اصلاحات کی جائیں گی۔

نظامِ عدل میں تغیّرات اور اُن کی نوعیت

سوال - اس برِ صغیر میں چونکہ تمام قانونی ضابطہ ہائے دیوانی، فوجداری، مالیاتی اور عملدرآمد کے قوانین (PROCEDURAL LAW) وغیرہ عرصہ سے ہر عدالت میں جاری و ساری ہیں، اور چونکہ ڈیڑھ صدی سے تمام لوگ بالخصوص جج و وکلاء وغیرہ نہ صرف ان قوانین سے پوری طرح مانوس بلکہ اس کا وسیع علم رکھتے ہیں، اس لیے بھی اسلامی مملکت کے قیام سے یہاں برطانوی دور کے نظامِ عدل

(BRITISH RULE OF LAW) کا سارا ڈھانچہ بدلنا ممکن نہ ہوگا۔ تو کیا پھر بھی عدالتی ریفارم لائی جائیں گی جبکہ اسلامی قانون کسی پہلو سے جامع، مرتب یا مکمل اور مدون (CODIFIED) نہیں ہے؟ اسلامی عدالتی نظام میں وکلا کی حیثیت کیا ہوگی؟ کیا اسی طرح PROCEDURAL LAW کے تحت انہیں مقدمہ جات لڑنے اور مقدمہ بازی (LITIGATION) کو طول دینے کا اختیار ہوگا؟ کیا اس موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی چور کے ہاتھ کاٹنے اور زانی کو سنگسار کرنے کی سزائیں دی جائیں گی؟ اور کیا قاضیوں کو قانونِ شہادت (EVIDENCE LAW) کی مدد کے بغیر فیصلے صادر کرنے ہونگے؟ پھر بین الاقوامی قسم کے ادارے مثلاً اقوام متحدہ (UNITED NATIONS) کی جنرل اسمبلی، سیکورٹی کونسل، بین الاقوامی عدالتِ انصاف یا کمرشل ٹربیونل اور لیبر قوانین وغیرہ کی عمل داری فیصل اندازی یا انٹرنیشنل لا پر عمل پیرا ہونے اور ان کی من وعن قبولیت کے لیے اسلامی حکومت کا کیا رویہ ہوگا؟ اگر اسی قسم کے ادارے اسلامی کنفیڈریشن یا اسلامی بلاک بنا کر عمل میں لائے جائیں تو ان کو کیا حیثیت حاصل ہوگی؟ کیا اسلامی قانون ساز اسمبلی کے پاس شدہ یا اجتہادی احکام پر اسلامی عدلیہ کو نظرِ ثانی (REVIEW) کرنے کا اختیار ہوگا؟ اسلامی ممالک اور مسلمانوں کو ایک اسٹیج پر لانے کے لیے اختلافات کس طرح رفع کیے جاسکتے ہیں؟

جواب۔ اس سوال کے جواب میں یہ بات پہلے ہی سمجھ لینی چاہیے کہ جب انگریزی حکومت اس ملک میں آئی تھی تو اس وقت سارا قانونی نظام (LEGAL SYSTEM) اسلامی فقہ پر قائم تھا۔ انگریزوں نے آکر اس کو یک لخت تبدیل نہیں کیا بلکہ انگریزی حکومت میں سالہا سال تک اسلامی نظامِ قانون ہی چلتا رہا۔ انگریز اس کو بتدریج تبدیل کرتے رہے اور رفتہ رفتہ انہوں نے اپنا نظام رائج کیا۔ اب اگر ہم اسلامی نظامِ قانون

کو از سرِ نو قائم کرنا چاہیں تو یہ تبدیلی بھی یک لخت نہیں، تدریج ہی سے ہو گی اور اس کے لیے بہت حکمت کے ساتھ ایک ایک قدم اٹھانا پڑے گا۔ اسلامی قوانین اگر مدوّن (CODIFIED) نہیں ہیں تو ان کے مدوّن (CODIFY) کرنے میں کوئی دقت نہیں ہے۔ اسی طرح اسلامی قانون کی شرحیں کثرت سے موجود ہیں، ان کو آسانی سے اردو زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے اور آگے نئی شرحوں کا سلسلہ چل سکتا ہے۔

اسی موجودہ ترقی یافتہ دور میں سعودی عرب میں زنا اور چوری کی سزائیں جاری ہیں۔ اور تجربے نے تمام دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انہی سزاؤں کی وجہ سے سعودی عرب میں جرائم کی اتنی کمی ہو گئی ہے جتنی دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے۔ اب اگر اس دور کے ترقی یافتہ ہونے کے معنی یہی ہیں کہ جرائم میں ترقی ہو تو مغربی قانونی سسٹم پر شوق سے عمل کرتے رہیے لیکن جرائم کا انسداد بھی اگر ترقی کے لیے ضروری ہے تو پھر یہ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ اسلامی قانون سے زیادہ کارگر کوئی قانون نہیں ہے۔ دراصل اس زمانے کی لادینی تہذیب کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی ساری ہمدردیاں مجرموں کے ساتھ ہیں۔ اسی لیے یہ نقطۂ نظر پیش کیا جاتا ہے کہ یہ سزائیں وحشیانہ ہیں۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہوا کہ چوری کرنا کوئی وحشیانہ کام نہیں ہے، البتہ اس پر ہاتھ کاٹنا وحشیانہ کام ہے۔ اور زنا کا ارتکاب تو مغربی تہذیب میں ایک تفریح ہے ہی۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس خیال کا ماخذ کیا ہے کہ اسلامی قانون میں قاضیوں کو قانونِ شہادت (EVIDENCE) کی مدد کے بغیر فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہے یا کوئی ایسا دستور العمل رہا ہے۔ حالانکہ خود قرآن نے قانونِ شہادت کے بہت سے اصول بیان کیے ہیں اور اس کی بیشتر تشریحات حدیث اور خلفائے راشدین کے فیصلوں سے ملتی ہیں۔ بالخصوص فقہائے ان اصولوں کو نہایت محنت سے ترتیب دیا ہے اور اسلامی دور میں کوئی ایسا قاضی نہیں گزرا جس نے ثبوت کے بغیر فیصلے صادر کیے ہوں۔

وکالت کے بارے میں میرے نزدیک صرف اتنی اصلاح درکار ہے کہ قانون کی پریکٹس بند کر دی جائے اور وکلاء کو اسٹیٹ معاوضہ دے۔ اب بھی قانون کا نظریہ یہ ہے کہ وکیل کا اصل کام اپنے موکل کی حمایت کرنا نہیں ہے بلکہ عدالت کو قانون سمجھنے اور منطبق (APPLY) کرنے میں مدد دینا ہے۔ وکالت کے پیشہ بن جانے کی وجہ سے یہ خرابی پیدا ہوئی ہے کہ وکیل عدالت کو گمراہ (MISLEAD) کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گواہوں کو سکھاتے پڑھاتے ہیں۔ عدالت کے سامنے مقدمے کی رُوداد غلط لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مقدمات کو طول بھی دیتے ہیں اور مقدمہ بازی کو بڑھاتے بھی ہیں۔

بین الاقوامی قسم کے تمام اداروں میں ہم شریک ہو سکتے ہیں۔ ان کے اندر اگر کوئی پالیسی ہمارے اصول کے مطابق نہ ہو گی تو ہم اس کی حد تک اپنی الگ پالیسی بنائیں گے اور اسی حد تک ہماری شرکت میں استثنا ہو گا۔ مسلمان ممالک خود اپنی دولت متحدہ (COMMON WEALTH) یا تحالف (CONFEDERATION) بنا سکتے ہیں اور اسلامی اصول کے مطابق باہمی تعلقات کے طریقے مقرر کر سکتے ہیں۔

اسلامی قانون ساز اسمبلی کے طے کیے ہوئے اجتہادی احکام پر اسلامی عدلیہ نظر ثانی (REVIEW) نہیں کر سکتی البتہ اگر وہ احکام قانون ساز اسمبلی کے اختیار سے متجاوز ہوں تو ان کو حدودِ اختیار سے متجاوز قرار دے سکتی ہے۔

اسلامی ممالک اور مسلمانوں کو ایک اسٹیج پر لانے کے لیے اختلافات رفع کرنے کی صورت ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ مسلمان ایمانداری کے ساتھ قرآن اور سنت کی ہدایات پر چلنے کے لیے تیار ہوں۔ قرآن کی تاویل اور سنت کی تحقیق میں اختلافات ہو سکتے ہیں لیکن وہ مل کر کام کرنے میں مانع نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم اس اصول کو مان لیں کہ جو شخص بھی قرآن اور سنت کو سند و حجت (AUTHORITY) مانے اور حضور سرورِ کائنات کے بعد کسی دوسری نبوت کا قائل نہ ہو وہ ہماری برادری کا آدمی ہے تو یہ چیز کسی آدمی کو ہماری برادری سے خارج نہیں کر سکتی کہ وہ کسی حدیث کو مختلف سمجھ رہا ہے اور اس کے نزدیک کسی معاملہ میں سنت سے کوئی اور بات ثابت ہوتی ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جتنی عدالتیں بھی پاکستان کے دستور اور قانون کو واجب الاطاعت قانون مان کر کام کرتی ہیں وہ سب اس ملک کی جائز عدالتیں ہیں۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام عدالتوں کے فیصلے بھی یکساں ہوں۔

مطبوعات

بستان المحدثین (اردو ترجمہ) یہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی جلیل المرتبت تالیف ہے۔ اس میں حضرت شاہ صاحب نے احادیث کے مختلف مجموعوں اور ان کے جامعین کا مختصر طور پر تعارف کرایا ہے۔ اس کا سببِ تالیف خود شاہ صاحب نے آغاز کتاب میں بیان فرمایا ہے کہ "چونکہ اکثر رسالوں اور تصانیف میں ایسی کتابوں سے حدیثیں نقل کی جاتی ہیں جن پر اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے سننے والوں کو حیرانی پیش آتی ہے اس وجہ سے اصل مقصود تو ان ہی کتابوں کا ذکر ہے مگر ضمناً ان کے مصنفین کا بھی ذکر ہے۔" اس کے بعد شاہ صاحب نے امام مالکؒ کی مؤطا سے لے کر امام بغوی کی مصابیح تک تقریباً ۹۵ کتابوں کا تعارف کرایا ہے۔ یہ تذکرہ جلیلہ مبتدی سے لے کر منتہی تک کے لیے یکساں لائق اعتنار و باعث افادہ ہے۔ محدثین کرام نے احادیث کی جمع و تدوین کا جو اہم کام سرانجام دیا ہے اس کتاب کے مطالعہ سے اس کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔ اصل کتاب فارسی میں تھی۔ کارخانہ تجارت کتب نے اس کا اردو ترجمہ شائع کر کے دینِ اسلامی کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ کتابت و طباعت معیاری ہے۔ قیمت پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ: کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ۔ کراچی۔ (خ۔ ح)

سہ ماہی اقبال ریویو مدیران: ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب و پروفیسر خورشید احمد صاحب۔ شائع کردہ: دی اقبال اکیڈمی، کراچی۔ سالانہ چندہ ۸ روپے۔ فی پرچہ ۲ روپے۔ صفحات ۱۰۴۔

یہ قابل قدر مجلہ سال میں دو مرتبہ انگریزی میں اور دو مرتبہ اردو میں شائع ہوتا ہے۔ یہ پرچہ اگرچہ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے افکار و نظریات کی توضیح و اشاعت کے لیے وقف ہے لیکن اس میں وہ سارے موضوع آجاتے ہیں جن پر ڈاکٹر اقبالؒ نے کلام کیا یا اُن کو دلچسپی رہی اس بنا پر تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، فلسفہ و منطق، تاریخ، تصوف، معیشت و سیاست

سب کے لیے اس مجلہ میں گنجائش موجود ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اس کا پہلا شمارہ ہے۔ اس میں یوں تو سارے مقالات ہی تحقیقی ہیں لیکن جناب پروفیسر خورشید احمد صاحب کا فاضلانہ مقالہ: اقبال اور اسلامی قانون کی تشکیل جدید" بڑا وقیع اور زوردار ہے۔ اس مقالے میں جہاں انہوں نے ڈاکٹر اقبال کے نظریۂ قانون سازی کی وضاحت فرمائی ہے وہاں انہوں نے مرحوم کے بارے میں پھیلائی ہوئی چند غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا ہے فاضل مقالہ نگار نے نہایت واضح دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ علامہ مرحوم اسلامی قانون کی تشکیل میں سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآنِ مجید کے بعد دوسری بنیاد قرار دیتے تھے۔ اور اس بارے میں اُن کا موقف امت کے دوسرے ائمہ سے مختلف نہ تھا۔ پھر اجتہاد اُن کی نظر میں آزاد خیالی کا ہم معنی نہیں بلکہ قرآن و سنت اور آثار صحابہؓ اور ائمہؒ کی تحقیق کی روشنی میں نئے نئے مسائل کے متعلق اسلامی احکام کی تلاش و جستجو ہے۔ اس لیے جو لوگ اجتہاد سے مراد ماضی سے انحراف لیتے ہیں وہ ہر لحاظ سے غلطی پر ہیں۔ پرچہ کا معیارِ طباعت نہایت عمدہ ہے اور اسے دیکھ کر عربی ممالک یا مغربی ممالک کا ذوقِ طباعت سامنے آجاتا ہے۔

(ع۔ ح)

نئی مطبوعات

دنیا و آخرت کو سنوارنے والا سنہری سلسلہ

اذکارِ مسنونہ مصنف: امام ابن قیم
مترجمہ: خلیل حامدی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: مجھے قبولیتِ دعا کی فکر نہیں، مجھے صرف دعا کی فکر ہے جب دعا کی توفیق نصیب ہو گئی تو قبولیت بھی حاصل ہو جائے گی۔۔۔ دعا مغز عبادت ہے۔ اور "اذکارِ مسنونہ" نبوی دعاؤں کا مستند ترین مجموعہ ہے جسے ساتویں صدی ہجری کے نامور عالم امام ابن قیم نے مرتب کیا ہے قیمت قسم اعلیٰ ۵۰-۲ قسم دوم

دین کی باتیں
مصنف: مولانا عبدالحی

ایمان کی تفصیلات کیا ہیں؟ عمل صالح کسے کہتے ہیں؟ ارکانِ اسلام سے مراد کیا ہے؟ اخلاق و حقوق اور سیاسیات میں دین کیا رہنمائی کرتا ہے؟ ان بنیادی امور کا نہایت آسان اور سادہ زبان میں تعارف۔ دیدہ زیب گردپوش۔ قیمت ۲ روپے

فقہ السنہ
از: محمد عاصم

ایک فقہی انسائیکلوپیڈیا جس میں اسلام کے پانچوں مشہور مذاہب کے فقہی احکام و مسائل کو نہایت مدلل طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ اردو زبان میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے پہلی جلد کتاب الطہارت اور کتاب الصلوٰۃ پر مشتمل ہے۔ کتابت و طباعت معیاری۔ قیمت ۸ روپے

تفسیر سورۂ نور
از مولانا مودودی

اسلام کے معاشرتی احکام و قوانین کا اچھوتا مجموعہ۔ وکلاء، عدالت، طلبائے قانون، اربابِ قضا اور فلسفۂ اجتماعیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بے نظیر کتاب۔

ہدیہ قسم عام ۷۵-۲۔ قسم اعلیٰ ۲۵-۳ روپے

اسلامک لا اینڈ کانسٹی ٹیوشن
(انگریزی) از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

اسلامی دستور کی بنیادیں۔ اسلامی ریاست کے خط و خال اور اسلامی ریاست کے دنیا کے دوسرے نظاموں سے ریاست سے ممتاز ہونے کے وجوہ۔ دستوری مسائل کا حل وغیرہ۔ ان تمام امور کی تفصیل آپ کو عہد حاضر کی شاہکار کتاب "اسلامک لا اینڈ کانسٹی ٹیوشن" میں ملے گی ضخامت ساڑھے چار سو صفحات۔ قیمت -/۱۲ روپے

ملنے کا پتہ: **شعبۂ کتب ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور**

اسلامی نظام تعلیم

از

سید ابوالاعلیٰ مودودی

* ہمارا صحیح نظام تعلیم کیا ہو ؟

* موجودہ نظام تعلیم میں کیا خرابیاں ہیں ؟

* ان خرابیوں کو دور کرنے کا کیا طریقہ ہے ؟

یہ اور ایسے ہی اہم سوالات کے جوابات مولانا مودوی کے قلم سے ــــــ طلبہ ، تعلیم یافتہ اور درس و تدریس سے تعلق رکھنے والے حضرات کے لئے خصوصی اہمیت کی حامل نئی نسلوں کو سوارنے کا ایک جامع منصوبہ ــــــ ہر پڑھے لکھے آدمی کے گھر میں اس کا ہونا ضروری ہے

خوبصورت سرورق * دیدہ زیب کتابت و طباعت * سفید کاغذ

ضخامت صفحات ــ قیمت ۶۲-۰ پیسے

اسلامک پبلیکیشنز لمٹیڈ
۱۱۔سی شاہ عالم مارکیٹ ۔ لاہور

نشری تقریریں

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ مولانا مودودی کی اُن غیر مطبوعہ تقاریر کا مجموعہ جو انہوں نے تقسیم سے قبل اور بعد آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کی تھیں ۔ ان تقاریر میں مختصر مگر جامع اور دلنشین انداز میں اہم موضوعات پر اسلام کا نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے در حقیقت کوزہ میں دریا بند ہے ۔ پہلی بار کتابی شکل میں شائع کی جا رہی ہیں

خوبصورت سرورق — عمدہ کتابت — نفیس طباعت

آپکی لائبریری کی زینت بننے کے قابل

ضخامت ۱۲۸ صفحات * قیمت مجلد -/۲ روپے

(سستا ایڈیشن ۱/۲۵) روپے

اپنا آرڈر جلد بک کرائیے مبادا یہ ایڈیشن جلد ختم ہوجائے اور آپ کو دوسرے ایڈیشن کا طویل انتظار کرنا پڑے